نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

نقوشِ اقبالؒ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱۔ کراچی ۱۸

نقوشِ اقبال

مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کی

عربی کتاب "روائع اقبال" کا ترجمہ
بعض اضافوں اور خود مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد

ترجمہ
مولوی شمس تبریز خاں

تصحیح و ترمیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی
کے بیش قیمت مقدمہ اور دیگر نئے مضامین کے اضافوں کے ساتھ

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

• ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
• صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ • رکن مجلس انتظامی و مجلس علما دار المصنفین اعظم گڑھ
• رکن عربی اکادمی دمشق • رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
• رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ • رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
• رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
• سابق وزٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی و مدینہ یونیورسٹی
• صدر اسلامی سینٹر آکسفورڈ

نام کتاب ————	نقوشِ اقبال
تصنیف ————	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت ————	مولائی پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ————	۳۲۰ صفحات

ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست نقوش اقبال

مضمون	صفحہ

دیباچہ طبع چہارم

از

مصنف

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی اشرف المرسلین محمد و اٰلہ وصحبہ اجمعین۔

مصنف کو "نقوش اقبال" کی اس پذیرائی پر جو برصغیر ہند و پاک میں اس کو حاصل ہوئی، مسرت بھی ہے، اور ایک گونہ حیرت بھی۔

مسرت اس بات پر کہ مصنف کے نقوش قلم نے اقبال کے نقوش جاوداں کے ساتھ ہم آغوش ہو کر تابانی اور درخشانی پائی، اور ان کا ستارۂ اقبال بھی بلند ہوا ؎

جمال ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

حیرت اس پر کہ اقبالیات کے اس عظیم و جلیل ذخیرہ میں جو عصر حاضر کے کسی مفکر، شاعر و ادیب کو میسر نہیں آیا، اس کتاب کو نہ صرف شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی، بلکہ اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا، اور شوق و قدردانی کے ہاتھوں سے لیا گیا، مترجم کتاب مولوی شمس تبریز خاں نے جب پہلی مرتبہ مصنف کی عربی کتاب "روائع اقبال" کے ترجمہ کی تجویز پیش کی، تو مصنف

کو اس کی اجازت دینے میں بڑا تردد تھا، اس لئے کہ یہ کتاب ان مضامین اور خطبات کا مجموعہ ہے، جو عرب نوجوانوں، اور عرب ممالک کے فضلاء، اور اقبال کے نادیدہ قدر دانوں، اور ان کے کلام کے شائقین کے لئے تیار کئے گئے تھے، اور ان کا مقصود ان لوگوں کو کلام و پیام اقبال سے آشنا کرنا تھا، جو فارسی، اردو سے نابلد ہیں، اور جن کے لئے عربی زبان کے سوا افہام و تفہیم کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

کلام اقبال کی سوغات ان لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری اور ہوتی ہے، جو اس کے مبادی تک سے ناواقف ہیں، اور ان لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی اور، جن کا دن رات کا وظیفہ کلام اقبال ہے، مصنف کو اندیشہ تھا کہ اگر اس کتاب کے مضامین کو اردو کے قالب میں پیش کیا گیا تو اس تحتی برِ اعظم کے اہل ذوق یہ کہہ کر اس کی بے وقعتی نہ کریں کہ "بضاعتنا ردّت إلينا" (ہماری ہی سوغات ہم کو واپس کر دی گئی) اس کو اس کا بھی احساس تھا کہ وہ اس کتاب کے ذریعہ (جس کا بیشتر حصہ مسافرت کی حالت میں لکھا گیا، جہاں، اقبالیات تو درکنار، خود اقبال کا پورا کلام بھی موجود نہیں تھا) اس ملک کے ادبیات و تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں کر سکے گا، جہاں لوگوں کی عمریں اقبال کے مطالعہ و تحقیق میں گذر گئی ہیں۔

لیکن مصنف کے لئے یہ ایک مسرت بخش انکشاف تھا کہ اس کتاب کا اس حلقہ میں استقبال ہوا، جو اقبال کے کلام و پیام کا رمز آشنا، اور ادا شناس ہے، اور جس کے شب و روز کلام اقبال کی صحبت میں گذرتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز ترین اہل نظر اور اہل ذوق نے اس کتاب پر جن تاثرات کا اظہار کیا، وہ مصنف کی توقع سے بہت زیادہ، اور اس کی حیثیت سے بہت بلند ہے، مصنف کے لئے اسی گھر کے چشم و چراغ فاضل گرامی جاوید اقبال صاحب کے یہ الفاظ ایک طرح کی سند کا درجہ رکھتے ہیں کہ "آپ نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کو ایسے

انداز میں پیش کیا ہے، جیسے اغلباً اقبالؔ محسوس کرتے، یا چاہتے تھے۔"

اس موقعہ پر اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ لائق مترجم نے (جو دبستان اقبالؔ کے ایک لائق طالب علم اور تربیت یافتہ ہیں) اشعار کی مناسب تشریح، اور جا بجا کچھ نئے اشعار کا اضافہ کر کے کتاب کی تاثیر و دل آویزی میں اضافہ کر دیا، اور اس کے حسن کو بڑھا دیا ہے۔

دوسرے ایڈیشن میں مخدومی پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مقدمہ کا اضافہ کیا گیا، یہ مضمون بجائے خود اقبالؔ کے کلام پر نقد و تبصرہ کے ذخیرے میں گرانقدر اضافہ کرتا ہے' اور فکر انگیز اور خیال افروز ہونے کے ساتھ رشید صاحب کے ادب و انشاء اور اقبالؔ شناسی کا بہترین نمونہ ہے۔

عرصہ سے مصنف کو اپنی دوسری مصروفیتوں کی بناء پر کلام اقبالؔ اور فکر اقبالؔ کے کسی نئے پہلو پر کچھ لکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اور وہ ان مضامین میں باوجود خواہش کے کوئی اضافہ نہیں کر سکا تھا، لیکن دفعتاً اس کی ایک تقریب پیش آگئی، اور اس نے "کلام اقبالؔ میں تاریخی حقائق و اشارات" کے عنوان سے بیرون ہند کی ایک مؤقر علمی مجلس کے لئے ایک مقالہ مرتب کیا، جو اصلاً اردو ہی میں لکھا گیا، وہ اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے، یہ ایک نئے زاویۂ نظر سے کلام اقبالؔ کا جائزہ ہے، جس میں ان کے فکر و مطالعہ کا ایک نیا گوشہ سامنے آگیا ہے، جو شاید اس وضاحت کے ساتھ اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔

اب نظر ثانی اور اس جدید مضمون کے اضافہ کے ساتھ "نقوش اقبالؔ" کا جدید ایڈیشن اہل ذوق کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

ابو الحسن علی ندوی

۱۱ رجب ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۷۵ء

دیباچہ طبع دوم

دل حمد وشکر سے لبریز ہے کہ اللہ تعالےٰ نے "نقوش اقبال" کو مقبولیت عطا فرمائی اور ملت کو اقبال کے پیغام میں دلچسپی لینے کی توفیق ارزانی کی اور اقبال کی یہ توقع ایک بار پھر ایک دوسرے انداز میں پوری ہوئی کہ ؎

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اس کتاب کا موضوع اور ملت کے لئے اقبال کا ورثہ ان کا "سوزِ نہاں" ہے جس کے لئے انھوں نے کہا تھا۔ ع

دیا اقبالؔ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا!

تقریباً سال بھر کے عرصہ میں کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا اس دوسرے ایڈیشن کی خصوصیات یہ ہیں کہ مترجم اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہٗ نے "نقوشِ اقبال" پر نظرِ ثانی کی اور مترجم نے دو نئے مضمون "اقبال اور وطنیت" اور

صورت' اقبال کے کلام میں ۹ اضافہ کئے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ادارہ کی درخواست پر جناب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے گراں قدر مقدمہ ------ لکھا ہے، ان اضافوں کے بعد کتاب کی افادیت اور بڑھ گئی ہے، امید کہ اللہ تعالیٰ ملت کو قدر دانی کی توفیق مزید بخشے گا۔

شمس تبریز خاں، لکھنؤ

یکم مئی ۱۹۷۲ء — ۱۶ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ

نقوشِ اقبال
مبصرین کی نظر میں

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مدظلہ

"مولانا ابوالحسن علی میاں نے اقبال پر ایک کتاب "روائع اقبال" کے نام سے عربی میں لکھی تھی، اب یہ نظر ثانی اور اضافوں کے بعد!........ اردو کے قالب میں ڈھل کر آگئی ہے، جو ہر اقبال پسند کے دیکھنے کے قابل ہے۔

اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی میاں صاحب نے اقبال کو عالم عربی کے سامنے کن کن پہلوؤں سے پیش کیا ہے، ترجمہ یا ترجمانی جو کچھ بھی ہے سلیس و شگفتہ ہے۔"

(صدق جدید لکھنؤ، ۱۰ ستمبر ۱۹۷۰ء)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

"مولانا کو اقبال کے کلام پر لکھنے کا سب سے زیادہ حق تھا اور انھوں نے اس کتاب میں اس کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے........ انھوں نے ان کی اہم نظموں اور متفرق اشعار سے اسلام کی بنیادی تعلیمات، ان کی روح اور ملت اسلامیہ کی

تجدید واصلاح، مغربی تہذیب اور اس کے علوم وغیرہ کے متعلق اقبال کے افکار و خیالات کا خلاصہ اور لب لباب پیش کر دیا ہے، جس سے اس کے اہم رخ سامنے آجاتے ہیں......... اگرچہ یہ کتاب مختصر ہے، لیکن اقبال کے مقصد، پیام اور افکار و تصورات کو سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے۔ عربی میں مصنف کا حسن انشا مسلم ہے لائق مترجم نے اس کی ساری خوبیوں کو ترجمہ میں منتقل کر دیا ہے، اور ترجمہ اتنا سلیس ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا....." (ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۷۱ء)

جناب ماہر القادری

"مولانا علی میاں نے علامہ اقبال کی نظموں اور شعروں کے انتخاب میں بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے انھوں نے اس خریطۂ جواہر سے سب سے زیادہ تابناک لعل وگہر چنے ہیں، فاضل مصنف نے جس حسن نزاکت اور دیدہ وری کیساتھ اشعار اقبال کی تشریح و ترجمانی کی ہے اسکی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر، اور ابن تیمیہ کا جوش واخلاص اس تصنیف میں کارفرما ہے، ترجمہ انتہائی سلیس اور شگفتہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے.........

اقبال پر بڑی اچھی کتابیں آئی ہیں، مگر یہ کتاب اس مجاہد عالم کی لکھی ہوئی ہے جو اقبال کے "مرد مومن" کا مصداق ہے اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ "نقوش اقبال" میں خود اقبال کی فکر اور روح اس طرح گھل مل گئی ہیں جیسے پھول میں خوشبو اور ستارو میں روشنی" (ماہنامہ فاران۔ کراچی مئی ۱۹۷۱ء)

مقدمہ

از

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی جس گھرانے کے چشم و چراغ ہیں وہ صدیوں سے اب تک غیر منقطع طور پر مذہب واخلاق، رشد وہدایت، تصنیف وتالیف اور زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے، ان حسنات کی جلوہ گری ان کی شخصیت ہی میں نہیں علمی، ادبی اور دینی خدمات میں بھی ملتی ہے، عربی زبان وادب نیز تحریر وتقریر پر موصوف کو جو غیر معمولی درک ہے، اور عالم اسلام کے دینی وثقافتی مسائل پر جیسا عبور ہے، اس کے سبب سے موصوف کے فرمودات کو ہندوستان ہی نہیں باہر کے ممالک اسلامیہ میں جو وزن اور وقعت حاصل ہے، وہ موجودہ ہندوستان کے شاید ہی کسی عالم دین کے حصہ میں آئی ہو، اس بنا پر سید صاحب کو ملت کا سفیر کبیر بننے کا حق پہنچتا ہے۔

میرا خیال ہے مولانا پہلے عالم دین ہیں، جس نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمایندہ اور عظیم شاعر اقبال کی شاعری اور شخصیت کا

مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا ہے، ورنہ بیشتر علمار عہد جدید کو بالعموم مشتبہ ورنہ بڑی احتیاط سے دیکھنے کی طرف مائل رہے ہیں، علمائے کرام کو اقبال کے سمجھنے کی کوشش کرنا خود ان کے لئے نہایت ضروری اور نیک فالی ہے، اس لئے کہ اب مذہب اور زندگی کی تفہیم اسی طرح اور اسی سیاق وسباق میں کی جائے گی، جو ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے، سید صاحب کا ذہن جدید ذہن کے تقاضوں سے آشنا ہے، اور اس کا لحاظ رکھتا اور احترام کرتا ہے، یہی انداز ندوہ کے ایک دوسرے مایۂ ناز فرزند سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کا تھا ——— دوسری طرف مذہب و اخلاق سے دلچسپی رکھنے والے ایسے ابھی کافی تعداد میں مل جاتے ہیں، جو جدید ذہن اور اپنی ذہنیت میں فرق نہیں دیکھ پاتے!

اقبال اور حالی کے کلام کا سنجیدگی اور احترام سے مطالعہ کئے بغیر ملت اور ملت کے بخشے ہوئے فضائل کا ادراک واحساس آسان نہیں ہے، یہ فیضان ہے عشق رسول کا جس نے ان شعراء کے کلام کو گرانمایہ اور لازوال بنا دیا ہے، نعت گوئی انتہائی مشکل اور معظم فن اور عبادت ہے، جلیل عظیم و مکرم وہ شخصیت ہے جسکے طفیل یہ وجود میں آئی، اس کی تصدیق اور اس کا اعتراف عرفی جیسے شاعر نے کیا ہے جو اپنے پندار شاعری کے سامنے مشکل سے کسی اور کی بڑائی خاطر میں لاتا ہے، اور اپنے دعویٰ کی تائید میں رہ رہ کر لوح و قلم کی شہادت پیش کرتا ہے، لیکن نعت کی وادی میں قدم قدم پر اپنے کو باخبر رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مثلاً:۔

عرفی مشتاب ایں رہ نعت ست، یا آستہ اکہ رہ بر دم تیغ ست قدم را

پھر کہتا ہے:۔

ہشدار! کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را!

یہ کچھ شاعروں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان کی مذہبی اور تہذیبی منزلت کا معیار یہ ہے کہ اس کی زندگی اور اس کا کردار کس حد تک عشقِ رسولؐ سے شرف و منیر ہے، عشقِ رسولؐ کا تصور ہمارے ذہنوں میں میلاد ناموں اور میلاد خوانوں کا دیا ہوا تھا حالیؔ اور اقبالؔ نے اس کو وہاں سے نکال کر مذہب و ملت کے اعلیٰ اقدار و روایات کو سمجھنے اس پر عمل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا حوصلہ دیا، خدا اور رسولؐ کے احکام کا احترام اور اس پر عمل کرنے کی توفیق کلیۃً اللہ کی دین ہے، لیکن ان اوامر و نواہی کو بتانا اور دلنشین کر دینا ان برگزیدہ شعراء کے حصے میں آیا ہے، جن کے حرفِ شیریں کی طرف اقبالؔ نے اپنے بے مثل پیرایۂ بیان میں اشارہ کیا ہے ؎

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا!

یہ وہ عظیم شاعری ہے، جو صحفِ سماوی کی مانند لازوال ہوتی ہے، اس لئے کہ انہی صحائف کی دی ہوئی اور انہی کی ترجمان ہوتی ہے، یہ شاعری مذہب کو تہذیب سے تہذیب کو مذہب سے اور دونوں کو زندگی سے مربوط، مستحکم اور تازہ کار رکھتی ہے، اردو شاعری میں اقبال کا یہی مرتبہ ہے، عرضِ حال اور مسدس میں حالیؔ نے، اور ارمغانِ حجاز اور اپنی دوسری نظموں میں جابجا اقبال نے جس سپردگی اور شیفتگی سے "خاصۂ خاصانِ رسلؐ" کو پکارا ہے، اور "حضورِ آیۂ رحمت" میں نظر آتے ہیں اس کو اردو شاعری میں ادبِ عالیہ کا درجہ حاصل ہے، کیا مبارک یہ اتفاق ہے کہ عربی زبان

میں عرب قوم کو اقبال کے پیغام سے آشنا کرنے کا امتیاز سید صاحب کے حصہ میں آیا۔
موصوف نے اقبال کے کلام اور شخصیت اور ان کی بعض مقبول ترین اور اردو میں شاہکار نظموں، بالخصوص، ارمغانِ حجاز پر اپنے خیالات و تاثرات کا جس خوبی اور خوبصورتی سے اظہار کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ نقوش اقبال یا عربی ایڈیشن روائع اقبال سے ہو سکتا ہے: عرب کا ریگزار، پائے مارا پرنیاں آید ہمی، اقبال جیسے عاشقِ رسول کا مدینہ طیبہ کا تصوراتی سفر، تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست، کے زیر و بم پر اونٹنی کا خرام، اپنے حالات و تاثرات کا طرح طرح سے اظہار اور اسی اعتبار سے اس سے چلنے کی فرمائش کرنا اور ترغیب دیتے جانا، ان سب کو کلام و خرام کے مطابق عربی میں ڈھالنا سید صاحب کی عربی انشا پردازی کا مکمل اور قابل آفریں نمونہ ہے۔

بہت دن ہوئے لاہور میں علامہ اقبال کی زبان سے ایک گفتگو سنی تھی، موضوع کچھ اس طرح کا تھا، اسلام عرب کی سرزمین پر کیوں نازل ہوا؟ فرمایا تھا کہ عرب کے سفر نصیب و صحراگرد بدوی کبھی متمدن نہیں ہوئے، تمدن و تہذیب بالآخر امتوں کے زوال کا باعث ہوئی ہے، اس لئے اسلام کی امانت کسی ایسی قوم یا سرزمین کو نہیں سونپی جا سکتی تھی جو تمدن کے لائے ہوئے عیش و عشرت کا شکار ہو سکتی تھی، چنانچہ عرب سے باہر مسلمان جب کبھی زوال کی زد میں آئیں گے، روشنی، حرارت اور حرکت حاصل کرنے کے لئے عرب کے ریگزار اور اس کے سخت جان اور سخت کوش بادیہ پیماؤں کی طرف رجوع کریں گے، آج یہ مقولہ یاد آرہا ہے، عرب کے ان صحرانشینوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی لیکن خود عرب کے

دیوان ہائے حکومت، عشرت کدوں، باہر کے لوگوں اور حکومتوں میں ان کی جیسی اور جتنی وقعت رہ گئی ہے، اسے دیکھ کر بڑی غیرت آتی ہے اور عبرت ہوتی ہے۔

بایں ہمہ اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے، اور امید بندھتی ہے کہ جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ اور اس دین اور اس کے حلقہ بگوشوں نے، عرب سے نکل کر دنیا کے دور دراز خطوں میں سچائی، سخاوت، اور سلامتی کا پیغام پہونچایا تھا، اس بھلائے ہوئے پیغام کو ایک برہمن زادنے جس کے آباء لاتی و مناتی تھے، ایک سید زادہ کی وساطت سے خود عرب اور عربوں کو آشنا کرانے کا قرض ادا کر دیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ بلاد عربیہ ہی نہیں دنیائے اسلام اس برہمن زاد کے اس اعلان حق سے کہ

محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی!

کس طرح تازگی و توانائی حاصل کرتی ہے، میر عربؐ کا یہ فرمانا کہ ہندوستان کی سمت سے مجھے ٹھنڈی ہوا آتی محسوس ہوتی ہے، ایسا تو نہیں اسی طرح کی بشارت ہو، لیکن کسے خبر کہ عالم عربی کا تصور ممالک عربیہ میں کیا ہے، محمدؐ عربی کا یا عرب طوائف الملوکی کا!

نعت شہ کونین کی طرح شہادت سید الشہدار اور سانحۂ کربلا کو اقبال نے جو نئی جہت، وسعت اور رفعت دی ہے، وہ بھی اردو شاعری میں ایک اہم اور گرانقدر اضافہ ہے، مرثیہ خوانی اور مرثیہ نگاری کو جو اہمیت ہمارے ادب اور زندگی میں ہے، اس کو اقبال نے ایک نئے تصور اور تجربے سے آشنا کیا اور ربط دیا، اس طور پر اردو شاعری اور ادب میں "مقام شبّیری" کی ایک نئی معنویت، دعوت یا سمبل (علامت) ظہور میں آئی اور مقبول ہوئی، اور وہ تصور جو نسبتہً محدود تھا لامحدود ہو گیا، مثلاً۔

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام　　　خون حسین بازدہ کوفہ و مصر و شام را

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسمٰعیل
حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی
قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق معرکۂ وجود میں، بدر و حنین بھی ہے عشق

زمانۂ قدیم سے عورتوں کے ساتھ عام طور پر جیسا ناروا سلوک کیا جاتا تھا اور ان کی عزت و عافیت کی طرف سے جو افسوسناک غفلت برتی جاتی رہی، یا دو عالمی جنگوں کے بعد دفعۃً تمام بندھنوں کے ٹوٹ جانے سے ان کو جو آزادی ملی اس کا اظہار یا مظاہرہ انھوں نے جس طرح کیا اس کا واضح نقشہ حالی و اقبال کے کلام میں ملتا ہے، اقبال نے آزادی میں ان کی خواری دیکھ کر ضربِ کلیم، اور جا بجا دوسری نظموں میں ان کے احترام میں جو کچھ فرمایا ہے، اس سے کون اتفاق نہ کریگا، مثلاً:-

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

رموزِ بیخودی کے آخر میں انھوں نے نوح کو اموست پر مبنی بنایا ہے، اور مسلمان عورتوں کے لئے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اسوہ کو تین نسبتوں سے کامل قرار دیا ہے،

(الف) نورِ چشم رحمۃ للعالمین
(ب) بانوئے مرتضیٰ مشکل کشا
(ج) مادرِ حسین سید الشہداء

حقوق وحدود نسواں کا ایسا منشور شاید ہی کسی اور نے کہیں دیا ہو!

اپنے اور گذرے ہوئے عہد کے نوع بنوع مسائل، حالات وحوادث اور اہم شخصیتوں پر جس گہری بصیرت سے ترشے ہوئے اشعار، مصرعوں اور فقروں میں اقبال نے اظہار خیال کیا ہے، وہ اردو شاعری میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ یہ آواز، انداز اور امتیاز اردو شاعروں کے کلام میں کم نظر آئیگا جن کے یہاں بھرتی کے اشعار کیں بھرتی کی غزلیں تک مل جاتی ہیں۔

اقبال کا کلام حشو و زوائد سے یکسر پاک ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ذوق کتنا انتخابی اور ذہن کتنا اختراعی تھا کہ معمولی کو غیر معمولی سے بے تکلف بدل سکتا تھا، وہ اعلیٰ کو جانتے ہوئے ادنیٰ پر کبھی اکتفا نہیں کر سکتے تھے، میرا خیال ہے کہ غالب، حالی، اکبر اور اقبال نے اردو شعر وادب کے حسب و نسب اور معیار و موقف کو پورے طور پر مستحکم نہ کر دیا ہوتا تو اس دورِ رسوائی و شکست وریخت میں، جب پچھلی تمام قدریں ٹھکرائی جا رہی ہیں، شعر وادب کے ہر روز نئے تجربے اور تحریکیں، جیسا کہ دیکھنے میں آرہا ہے، اردو شاعری کو معلوم نہیں کس ناگفتنی تک پہنچا دیتیں ——— ہیئت، موضوع، مواد اور حسن زبان و بیان کے اعتبار سے اقبال کا کلام نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے ایسا نمونہ جس تک پہنچنا ناممکن نہیں تو نہایت درجہ دشوار ہونے میں شک نہیں۔

ایک مکتبۂ فکر کے اصحاب کا اقبال پر یہ اعتراض ہے کہ وہ عقابی یا شاہینی مسلک، خونریزی کی تبلیغ اور فرد کو جماعت پر مسلط کرنے اور رکھنے کی تائید کرتے ہیں، سوال بہت پرانا ہے، لیکن جواب نہایت مختصر ہے، یعنی خونریزی اور سفاکی کی جو شخص

کیسے تائید کرے گا، جو رحمتہ للعالمین کے صفِ اول کے عاشقوں میں ہو جس کی تفصیل "نقوشِ اقبال" میں بڑے شرح و بسط سے کی گئی ہے، فرد اور جماعت کے باہمد گر رشتہ اور ذمہ داری کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے معترض کو اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کا مطالعہ غور و فکر سے کرنا چاہئے، اقبال نے فرد کی دوگونہ تربیت پہ زور دیا ہے، ایک بحیثیت فرد کے دوسرے بحیثیت جماعت کے ایک رکن کے، بالفاظ دیگر جب تک فرد اور جماعت ایک بڑے مقصد کے لئے فکر و عمل دونوں طرح سے مربوط و متحد نہ ہوں گے سوسائٹی مستحکم، صالح اور صحت مند نہیں رہ سکتی شائستگی، دانشوری اور آرزومندی جس پر سوسائٹی کے قیام و ترقی کا مدار ہے، شروع فرد سے ہوتی ہے، ختم جماعت پر ہوتی ہے، دونوں کی تربیت کو ایک دوسرے سے علٰحدہ اور دور رکھنے کے لئے نہیں بلکہ ان کو ہم خیال، ہم مقصد، اور ہم آہنگ رکھنے کے لئے ہوتی ہے، فرد کی ہدایت اور قیادت کے بغیر جماعت بڑی قابلِ رحم ہوتی ہے، اتنی ہی خطرناک بھی، فرد کی تربیت اس لئے کی جاتی ہے اور اس کا فرض یہ ہے کہ وہ جماعت کو صراطِ مستقیم پر چلائے اور رکھے، نہ یہ کہ اپنی غرض اور ہوس کا آلۂ کار بنائے، اقبال کا بتایا ہوا فرد اور جماعت کا رشتہ ایسا ہے، جس سے دونوں ایک دوسرے سے باہر نہ ہو سکیں، اور ایک دوسرے کا جبر قبول نہ کر سکیں

جبر و تشدد کے الزام کی تائید میں اکثر اقبال کے دو ایک شعر پیش کئے جاتے ہیں، جن کا مفہوم عقاب یا شاہیں کا کبوتر پر جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے یا عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد وغیرہ قسم کا ہے، لیکن اس کے ساتھ اقبال کی اس

تحدید و تاکید کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے، جس کے ذکر سے وہ کبھی نہیں تھکتے۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

زندگی اور زمانہ جیسا کچھ ہے اس میں عزت، عافیت، اور فراغت کے ساتھ زندہ اور کارآمد رہنے کا اس سے زیادہ معتبر اور کیا فارمولا ہو سکتا ہے، تواضع بغیر طاقت کے خوئے گداگری ہے، طاقتور ہونا فرائض میں ہے، اس کا بے جا استعمال بزدلی یعنی شقاوت ہے، مشکل کشا فرد ہوتا ہے، جماعت نہیں ــــــ ــــــ اسی طرح کلیمی بغیر عصا کے فعل عبث ہے جس کی سب سے نمایاں مثال اقوام متحدہ کی تنظیم ہے!

سید صاحب کے ایک متبحر اور روشن خیال عالم دین اور شعر و ادب کے بصر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، موصوف نے اقبال کی تائید و ترجمانی جس خوبی سے کی ہے، اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے، کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے، جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا، اس لئے کہ وہ ایک عظیم شاعری میں ڈھل چکا ہے، اسلامی عقائد، شعائر اور روایات کا جس عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے بے مثل کلام میں اقبال نے وکالت کی ہے، اس سے مسلم معاشرہ حیرت انگیز طور پر متأثر ہوا ہے، ایسی صحت مند اور با مقصد بیداری کا امتیاز شاید ہی کسی اور عہد کے علم کلام کے حصہ میں آیا ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی کتب کے براہ راست مطالعہ سے جض

طبائع اور اذہان اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنا انہی حقائق کو اقبال کے کلام میں مطالعہ کر کے مطمئن ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ اقبال کے مشہور لکچر "اسلام کی تشکیل نو" میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کو جہاں تہاں تسلیم کرنے میں اکثر علماء کو تامل ہوا ہے لیکن انہی حقائق کو اقبال کی شاعری میں سن یا پڑھ کر بے ساختہ قائل ہو جاتے ہیں، اس طرح جیسے وہ نکتے اپنے تمام معارف و بصائر کے ساتھ براہ راست ان پر منکشف ہو گئے ہوں۔

اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے، اور خود ان کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ انھوں نے تمام عمر مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزاری ہے اس مطالعہ نے ان کے سوچنے اور کہنے کو کس طرح متاثر کیا اس پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں، کہنا یہ ہے کہ اقبال نے ہمارے جذبۂ تخیل اور فکر کو جس خوبی سے جس غیر معمولی حد تک متاثر کیا وہ ان کا فلسفہ نہیں ہے ان کی شاعری ہے۔

اس میں جہاں کہیں تنوع یا تضاد ملتا ہے، وہ اس کا ثبوت ہے، تنوع یا تضاد شاعری کا حسن یا مزاج ہے اور فلسفہ کا نقص یا نارسائی، اقبال نے فلسفہ کو شاعری کا منافی نہیں بتایا ہے، بلکہ ان کو ایک دوسرے کی محرمی اور مشاطگی پر مامور کیا ہے، فلسفہ کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اور آخرکار فلسفہ کو گوارا اور فعال شاعر اور اس کی شاعری ہی بناتی ہے۔

اطالوی فلاسفر کروچے (CROCHE) (۱۸۵۶ء تا ۱۹۵۲ء) مذہب کو علم الاصنام سے تعبیر کرتا ہے، لیکن یہ تعبیر ان قدیم اور قدیم تر مذاہب پر صحیح اترتی ہے جو دیوی دیوتاؤں کی کارفرمائی اور کارناموں سے مملو اور مزین ہیں۔ جہاں بقول اقبال

"خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر" ان مذاہب پر صادق نہیں آتی، جہاں ان دیکھے خدا کو مانتے ہیں، البتہ جارج سنتیانا (GEORGE SANTYANA) امریکی فلاسفر (۱۸۶۳ء۔۱۹۵۲ء) کے اس قول کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب شاعری کی ایک صنف ہے، یہ نظریہ صحیح ہے یا نہیں، یہ حقیقت مسلم ہے کہ دورِ جاہلیت کے عرب پہلی بار کلام الٰہی کی زد میں آئے تو اس کی اصلاحی و اخلاقی احکام سے اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنے اس کے اسلوب و آہنگ اور فصاحت و بلاغت سے مرعوب ہوئے، اور بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ شاعری نہیں ساحری ہے! یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ صحائف سماوی یا نیم صحائف سماوی اپنے عہد کے بہترین کلام شمار کئے گئے ہیں، خواہ ان کا مصنف کوئی رہا ہو، ایسا نہ ہو تو ان کا لایا ہوا دین، ذہنوں کو متاثر نہ کر سکتا، مذہب شاعری نہیں ہوتا، لیکن شاعری سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا مذہب کے اوامر و نواہی کو جس طرح صلحا و اتقیا اپنے عمل سے تعمیل کی ترغیب دیتے ہیں، اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑے شعرا اپنے کلام سے ان کو مؤثر کرتے اور وقیع بناتے ہیں، کبھی کبھی تو یہاں تک خیال آیا ہے کہ ہم پر عام طور سے آج مذہب کا جو اثر ہے، بالخصوص ان پر جو مذہب کو اتنا اعتقاد سے نہیں جتنا عقل سے دیکھنے پرکھنے کے شائق ہیں، وہ براہِ راست اتنا مذہبی تصانیف کا نہیں ہے، جتنا اقبال کے اس کلام کا جس میں مذہب، اخلاق، اور تاریخ کے تقاضوں کی طرف رہبری ملتی ہے!

میرا خیال ہے، سید صاحب کو میرے اس خیال سے کہ اقبال کا کلام اس صدی کا علم کلام ہے، اختلاف نہ ہوگا!

سید صاحب سے ایک التماس یہ ہے کہ موصوف اقبال کے پورے کلام کو عربی میں منتقل کر کے اس کا خوبصورت ایڈیشن مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے ان ممالک میں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں جہاں عربی مادری، علمی، اور تصنیفی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، یہ مجلس کے پروگرام میں بڑا مفید اور مبارک اضافہ ہوگا، سید صاحب کو دین سے جو شغف ہے، عربی زبان وادب کے جیسے مزاج داں ہیں، ممالک عربیہ اسلامیہ میں انکا جیسا اعتبار ہے، اقبال سے جیسی عقیدت اور ان کے کلام میں جو درک وبصیرت ہے، ان کا تقاضا ہے کہ موصوف اس منصب کی ذمہ داری قبول فرمائیں، یہ ایسا کام ہے جو ہر روز ہر شخص کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔

رشید احمد صدیقی
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۹ راپریل ۱۹۷۳ء

کچھ ترجمہ کے بارے میں

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی "روائع اقبال" کے اردو ترجمے کی کئی حیثیتوں سے ضرورت تھی، اردو دنیا، اقبال اور مولانا سے تعلق رکھنے والوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ روائع کا اردو ترجمہ ہو، اس لئے کہ اقبال اور مولانا مدظلہ کی فکری ہم آہنگی کا یہ فطری تقاضا تھا کہ ایک زندۂ جاوید ہستی پر ایک زندہ شخصیت کے خیالات سے استفادہ کیا جائے۔

مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی کسی چیز کی اہمیت علمی و ادبی قدر و قیمت کے ساتھ اسکی اسلامیت اور ان کے دعوتی طرز نگاہ کے پہلو سے بھی ہوتی ہے، اردو میں اقبال پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "روح اقبال" مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کی "اقبال کامل" اور خلیفہ عبدالحکیم کی "فکر اقبال" بہت اہم سمجھی جاتی ہیں، جن میں اقبال کے افکار کی تنقید و تحلیل بڑے عالمانہ انداز میں ہو چکی ہے، لیکن خلیفہ عبدالحکیم نے صحیح لکھا ہے کہ اقبال کا موضوع ایسا ہے کہ

اس پر کچھ مزید لکھنے کیلئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کو خاص طور پر ان کے دینی رجحان اور دعوتی میلان کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش اب تک بہت کم ہوئی ہے، روائع میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اقبال کے قلب و روح تک پہنچنے اور اس کی چند جھلکیاں دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے تنقید و تحلیل، علمی تشریح و تجزیہ اور کسی حاشیہ آرائی کے بجائے اقبال کی ترجمانی کے لئے کلام اقبال کو رہنما بنایا گیا ہے، یہ طرز جدید تنقید کے معیار پر بالکل پورا نہ بھی اترتا ہو تو بھی اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کسی مفکر کے قلب و نظر تک رسائی کے لئے یہ سب سے اچھا طریقہ ہے کہ براہ راست اس کے کلام سے استدلال کیا جائے اور اسے اس کے پیام میں دیکھا جائے، ع

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اقبال کے ہاں جذبہ اور خیال کی مثالی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، انکے قلب و نظر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ایمان و یقین کے نور سے روشن نہ ہو، اور جس پر اسلامیت کی چھاپ نہ لگی ہوئی ہو، اقبال نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، علم و ادب، مذہب و تہذیب، معیشت و معاشرت، تاریخ و سیاست کے ہر پہلو سے بحث کی ہے، اور انھیں اپنے افکار کا موضوع بنایا ہے، لیکن ان سب میں اگر کوئی چیز قدر مشترک کہی جا سکتی ہے تو وہ ان کی اسلامیت اور مومنانہ انداز نظر ہے جو ان کے علوم و فنون کی ہر شاخ میں اس طرح رواں دواں ہے کہ ع

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم!

اسلام نے انھیں شدت سے متاثر ہی نہیں کیا ہے بلکہ وہ انکا آخری اور قطعی عقیدہ و ایمان بھی بن گیا ہے، اور اس ایمان نے انھیں زندگی کے ہر مسئلے میں ایک واضح ہدایت دی ہے۔

اقبال فلسفی پہلے ہوں یا شاعر بہر حال انھوں نے شعر ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے اس لئے اب ان کے افکار کو جب بھی سمجھنے کی کوشش کیجائے گی تو فنی نقطۂ نظر کو مقدم رکھنا ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ شعر کیلئے فکر کی اتنی اہمیت نہیں جتنی جذبہ کی شدت احساس کی واقعیت اور خلوص کی حرارت کی ہوتی ہے ــــــــــ اسلام سے اقبال کا لگاؤ صرف فکری نہیں بلکہ جذباتی بھی ہے، فکر کی مئے مینا گداز ان کے ہاں جذبہ کی آنچ سے دوآتشہ ہوگئی ہے، اقبال کو خالص عقلی سطح سے سمجھنے کی کوشش کرنا برگ گل کی کیمیائی تشریح و تجزیہ کرنے کے مرادف کہا جاسکتا ہے، اقبال کے سوز و ساز اور درد و گداز انکے دلوں کی تپش اور ان کی شبوں کی خلش کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عقل کی غلامی سے آزاد دل کی رہنمائی میں ان کے احوال و مقامات کی سیر کی جائے۔

اقبال ولایت عشق کے سپاہی اور دیار مہر و وفا کے راہی ہیں، انھوں نے عالمی ادبیات کی تاریخ میں پہلی بار اتنے شور و شعور اور اتنے جوش و ہوش کے ساتھ عقل کے خلاف آواز اٹھائی اور عشق کی حیثیت عرفی بحال کی۔

انھوں نے دور جدید کے عقلی آزرکدوں میں از سر نو رومی و سنائی، عطار اور جامی کے دلوں کا سوز عام کیا، انھوں نے عقل کی زیاں کاریوں کا علاج عشق و محبت کی دوائے دل سے کیا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ عہد حاضر میں انھوں نے انسان کے قلب و ضمیر، اس کی روحانیت و معنویت، اور اس کی باطنی قوت کی بازیافت کی۔ اور عقل و دماغ فکر و نظر کے مسلسل سفر کے بعد بھی انسان کو جو منزل نہیں میسر آسکی تھی اسے عشق کی ایک جست میں وہاں پہنچا دیا اقبال کے کارنامے کی دہری حیثیت اس وقت ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے فلسفہ و سائنس کے عہد میں انسان کو اس کے

باطنی سرچشمہ تک پہنچایا اور اس کی طرف متوجہ کیا، دوسرے مسلمانوں کے سامنے عشق و محبت کی شاہراہ مقصود کھول کر اسلام کو از سرِ نو روشناس کیا، اور اس کے روحانی اور اخلاقی انقلاب کی عظمت بھی دوبالا کی۔

بیادہ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق

کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است!

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ روائع میں اقبال کے باطن، انکی اندرونی شخصیت، اور ان کے قلب و روح کو اس کی فطری حالت میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جہاں وہ خدا کی حمد کرتا ہے، اور اس کا دل خدا و رسولؐ کی محبت میں سرشار اور بیقرار نظر آتا ہے، جہاں وہ اسلام کی عظمت رفتہ پر آنسو بہاتا ہے، جہاں وہ تاریخ اسلام کے عروج و زوال پر نظر باز پسیں ڈالتا ہے، جہاں وہ اسلامی نظام حیات کے غم میں گھلتا ہے، جہاں وہ مومن کے جلال و جمال کے ترانے گاتا ہے، جہاں وہ اسلام کے مستقبل سے پر امید نظر آتا ہے، اس کے دل کی دھڑکنوں پر اگر کان لگائے جائیں تو یہی آوازیں اس میں گونجتی سنائی دیں گی، اس کا کلام انھیں دھڑکنوں کی روداد اور ان کا ریکارڈ ہے۔

فیضی گماں مبر کہ غم دل نہفتہ ماند

اسرارِ عشق آنچہ تواں گفت، گفتہ ایم!

اس کتاب میں آپ کو جگہ جگہ اقبال کے عشق رسول کا تذکرۂ شوق انگیز ملے گا، اس بوئے گل سے انکا نفس نفس مشکبار اور ان کی سطر سطر عطر آگیں ہے۔ اقبال کی شخصیت کے عناصرِ اربعہ کی اگر تلاش کی جائے تو شاید خدا پر ایمان، رسولؐ سے عشق، اسلام کی ابدیت پر یقین، اور مردِ مومن کے امکانات سے توقع اور اسکی ذات سے بے پایاں محبت ہی کی دنیا ہوگی

مخدومی رشید احمد صدیقی نے بہت صحیح کہا ہے کہ اقبال پر دنیا کے بڑے مذہب کی گرفت اتنی نہیں جتنی ایک بڑی شخصیت کی ہے۔

اب نفس کتاب سے متعلق چند تصریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں، فکری لحاظ سے بھی "اقبال اور مغربی تہذیب و ثقافت"، "اقبال اور عصری نظام تعلیم" "اقبال کا نظریۂ علم و فن"، "انسانِ کامل اقبال کی نظر میں"، "شخصیت اقبال کے تخلیقی عناصر" اس مجموعہ کے اہم مضامین ہیں، دونوں موخر الذکر ترجمے جناب طیب صاحب عثمانی ندوی کے ہیں، جو ان کی کتاب "حدیثِ اقبال" سے لئے گئے ہیں، "اقبال در دولت پر" کا ترجمہ مولانا محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" کے قلم سے ہے، جو "کاروانِ مدینہ" سے لیا گیا ہے۔

"روائع اقبال" کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسکے اولیں مخاطب عرب تھے اور یہ انھیں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی، اسلئے اس میں اقبال کے کلام کے وہ حصے خصوصیت سے لئے گئے تھے، جو عربوں سے متعلق تھے "مثلاً بلاد عربیہ کے نام" "پس چہ باید کرد" کی نظم "حرفے چند با امت عربیہ" کا ترجمہ ہے "مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، طارق کی دعا، ابو جہل کی نوحہ گری، جاہلیت کی بازگشت" بھی عربوں سے متعلق ہے، لیکن عجم کے صاحب ذوق بھی ان سے پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

روائع کا مقصد عرب ممالک میں اقبال کا تعارف تھا، اسلئے انکے سوانح و افکار کے اجمالی جائزہ کے ساتھ ہی انکی چند بہترین شاہکار نظموں کا ترجمہ بھی کیا گیا تھا، اس سلسلے میں میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی بہترین نظمیں اس مجموعہ میں آگئی ہیں "یعنی مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ابلیس کی مجلس شوریٰ، ساقی نامہ، جاوید نامہ" اور "مثنوی مسافر" کے اہم حصے بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں، اردو میں اس ترجمے کے ترجمے کا زیادہ لطف تو نہیں لیکن مصنف کے

جذبات وخیالات کی اہمیت کے پیش نظر اس کا بھی ایک خاص مقام ہے ــــــ "روائع اقبال" کی عرب دنیا میں بڑی اہمیت ہے، اس سے پہلے جناب عبدالوہاب عزام.... (سفیر مصر) نے اقبال کا عربی میں منظوم ترجمہ کیا تھا، اور ایک مصری فاضل عباس محمود نے "تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام" بھی لکھی تھی۔

لیکن اقبال کا تعارف نہیں ہو سکا تھا چنانچہ عالم عربی کے اسلامی ادیب علی طنطاوی نے مولانا کے نام مجلۃ المسلمون" (دمشق) میں ایک کھلا خط شائع کیا جس میں انھیں اس کام کی طرف متوجہ کیا گیا تھا، مولانا نے انہی تقاضوں کے پیش نظر چند مضامین سپرد قلم کیے جو کتاب بن گئے "روائع اقبال" منظوم ترجمہ نہیں لیکن اسکی فصاحت وادبیت اتنی مسحورکن ہے کہ اسے شعر منثور کہا جاسکتا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ اردو ترجمہ میں اصل کی خوبیاں نہیں آسکی ہیں۔

یہ کتاب اقبالیات میں کوئی اہم اضافہ تو نہیں لیکن اقبال کے شائقین کی دلچسپی کی چیز ضرور ہے اور اپنے بعض پہلوؤں خصوصاً عوتی طرز فکر کی صحت اور ذوق کی اسلامیت کے لئے ممتاز ہے، ویسے بھی اقبال کے سلسلے میں کوئی حرف آخر کہنے کا دعوی کیا بھی نہیں جاسکتا،

شوق گر زندۂ جاوید نباشد عجب است
کہ حدیث تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

شمس تبریز خاں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
یکم ربیع الاول ۱۳۸۰ھ ہجری
مطابق ۱۹ مئی ۱۹۶۰ء

میرا تعلق اقبالؒ اور انکے فن سے

میری نشو ونما اس عہد میں ہوئی جب اقبال کا فن شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکا تھا اقبال کا اپنے عہد پر جو اثر تھا اس کی مثال کسی زمانے کے شاعر و ادیب میں نہیں ملتی، اسلئے اگر میں نے انھیں اپنے بچپن میں پسند کیا اور جب سن تمیز کو پہونچ کر ان کو اپنا موضوع بنایا، تو یہ محل تعجب نہیں۔

اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے، انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے، انسان بہت خود بین و خود پسند واقع ہوا ہے، اس کی محبت اور نفرت تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے، اس لئے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے، جو اس کی آرزوں کا ساتھ دے سکے اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے، میں بھی اپنے کو اس کلیے سے الگ نہیں کرتا، میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا، اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی

ہے، وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا

بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔

سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی محبت اور ایمان ہے،

کا حسین امتزاج انکے شعر اور پیغام میں ملتا ہے، اور جس کا انکے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا،

میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف

بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور

تسخیر انفس و آفاق کیلئے ابھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا

ہے، جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے،

میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر

ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں، اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور

باغی ہیں ـــــــ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گزشتہ کے لئے سب سے زیادہ

فکرمند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے

عظیم داعی ہیں۔

میں نے بچپن اور عنفوان شباب میں انکے شعر پڑھنا شروع کئے بعض نظموں کو عربی کا

جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی لیکن صحیح یہ ہے کہ میں نے اس وقت صرف "بانگ درا" پڑھی تھی، انکے

فارسی مجموعے نکل چکے تھے، لیکن اس وقت تک میں ان کا ذوق شناس نہیں ہوا تھا۔

اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی جب میں اپنی عمر کے سولہویں سال میں تھا،

یہ وہ موقع تھا جب میں نے شہر علم و ثقافت ـ لاہور ـ کی سیر کی، مئی کے آخری گرم دن تھے جب

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (حال استاذ اسلامی فن تعمیر پنجاب یونیورسٹی) مجھے اقبال کی خدمت میں لے گئے

اور مجھے ان کے شعر کے شائق کی حیثیت سے پیش کیا وہاں انھوں نے میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (م ۱۳۴۱ھ) کا بھی ذکر کیا جنھیں اقبال اور دوسرے ادیب و نقادان کی گرانقدر کتاب "گل رعنا" کی وجہ سے جانتے تھے، جو تازہ نکلی تھی، اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

میں نے اس صحبت میں ان کی نظم "چاند" کا عربی ترجمہ انھیں پیش کیا اقبال نے اسے دیکھ کر مجھ سے بعض عرب شعراء کے متعلق کچھ ایسے سوالات بھی کئے جن سے میری معلومات کا اندازہ ہو ــــــــ اس کے بعد مجلس ختم ہوئی اور میں اس عظیم شاعر کی تواضع، سادگی، بے تکلفی کا نہایت اچھا اثر لے کر واپس ہوا، جو ان کی بات چیت اور زندگی میں نظر آتی تھی۔

۱۹۲۹ــــ۱۹۳۷ء کے درمیان لاہور میرا اکثر جانا اور مہینوں ٹھہرنا ہوتا لیکن یہ سوچ کر اس عظیم شاعر سے ملنے کی تمنا نہیں پیدا ہوتی تھی کہ ابھی تو وہ بہت دنوں ہمارے درمیان رہیں گے ویسے بھی بڑے لوگوں سے ملنے کے معاملے میں میں طبعاً شرمیلا، اور عزلت پسند واقع ہوا ہوں میری طالب علمانہ زندگی اور مصروفیت کو بھی اس میں دخل تھا۔

اس مدت میں ان کے دو اردو مجموعے ان کی فارسی گوئی کے طویل زمانے کے بعد منظر عام پر آ چکے تھے، اسلامی اور ادبی حلقوں میں ان کا بڑا چرچا تھا، اور واقعہ بھی یہ تھا کہ ان میں ان کی شاعری اور ان کے فکر کی پختگی بہت نمایاں اور ان کی دعوت بہت واضح تھی۔

اس وقت "ضرب کلیم" کو میں زیادہ پسند کرتا تھا اگرچہ بعد میں "بال جبریل" کی طرف میری توجہ اور دلچسپی بڑھتی گئی، اور نقل و ترجمہ کا کام زیادہ تر اسی سے لیا گیا۔

میں اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی فرائض انجام دیتا تھا، برادر محترم مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ ہی مقیم تھا، اس لئے اقبال کے شعر ہم ایک دوسرے کو سناتے اور لطف لیتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب کی اقبال کے بارے میں حمایت حمیت تک

پہنچی ہوئی تھی، وہ ان کے بڑے پرجوش مبلغ تھے۔

ہمیں یہ بات کھٹکتی تھی کہ ٹیگور، اقبال کے مقابلے میں بلادِ عربیہ میں زیادہ روشناس ہیں، اور مصر و شام وغیرہ کے عرب ادیب ان کے عام طور پر گرویدہ ہیں، ہم اس صورتِ حال کو اپنی ہی کوتاہی کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اقبال کو متعارف نہیں کرایا عربی مجلات میں ٹیگور وغیرہ پر جب کبھی ہم تعریفی مقالات دیکھتے تو اقبال کے عربی ترجمہ کا عزم تازہ ہو جاتا اور اسے اپنے ذمہ قرض و امانت سمجھنے لگتے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسلام کے اس عظیم شاعر کی وفات سے چند ماہ پہلے ایک تفصیلی اور تاریخی ملاقات کا موقع ملا۔ (۱۶ر رمضان ۱۳۵۶ھ۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۳۷ء) کی تاریخ تھی جب میں اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ[1] حسنی (سابق استاذ اورینٹل کالج لاہور) کے ساتھ اقبال کے دولت کدے پر گیا برادرِ عزیز مولوی سید ابراہیم حسنی بھی میرے ساتھ تھے، یہ اقبال کی طویل علالت کا زمانہ تھا، لیکن وہ بڑے نشاط و انبساط کے ساتھ ملے، ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کی آمد سے انھیں یہ وقتی مسرت حاصل ہوئی ہو، غرض اس دن ان کی طبیعت کے بند کھل گئے تھے، ہماری نشست بڑے خوشگوار ماحول میں جاری رہی ان کا بوڑھا خادم (علی بخش) بیچ بیچ میں آ کر انھیں زیادہ بیٹھنے اور بات کرنے سے روکنا چاہتا، لیکن وہ اسے ٹال جاتے اس صحبت میں ہر طرح کے موضوعات زیرِ بحث آتے رہے، سلسلۂ گفتگو میں شعرِ جاہلیت کا ذکر آیا تو اقبال نے اس کی صداقت و واقعیت، اس کے جوش و خروش کا پسندیدگی کے ساتھ ذکر کیا، اور حماسہ کے بعض اشعار پڑھے۔

وہ کہنے لگے کہ اسلام اپنے پیروؤں میں علمیت اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے

---

[1] افسوس ہے کہ جمعہ ۲۲ر رجب ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۵ر ستمبر ۱۹۷۰ء کو مولانا نے کراچی میں انتقال کیا۔

اور ادھر آج کی سائنس بھی اپنی حقیقت پسندی اور تخیلات سے گریز میں اسلام سے قریب نظر آتی ہے، اسلام کی دو صدیوں میں مسلمانوں میں یہ روح زندہ رہی جس کے نتیجے میں وہ عقیدہ و عمل، سیرت و اخلاق کے جادۂ استوار پر گامزن رہے لیکن یونانی فلسفۂ الٰہیات نے مشرق کو مرد بیمار اور بیکار بنا دیا ـــــــ یورپ کی نشأۃ ثانیہ بھی اسی وقت ہوئی جب اس نے اپنے کندھوں سے فلسفۂ مابعد الطبیعیات کا جوا اتار پھینکا اور مفید تجربی علوم کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس عہد میں وہ مسائل پیدا ہونے لگے جنھوں نے یورپ کو بھی رجعت پسندی کی لائن پر ڈال دیا، انھوں نے کہا کہ عربی مزاج اسلام کیلئے بہت سازگار ثابت ہوا لیکن عجمی تخیلات نے اسلام پر وہی ظلم کیا جو کلیسا نے یورپ پر کیا تھا، مجموعی طور پر آریائی فکر نے دونوں مذہبوں کو کم و بیش اپنی گرفت میں لے لیا۔

آپ نے تصوف کے ذکر میں بعض صوفیہ کے فکری غلو پر تنقید کی اور وجد و سماع کے بارے میں کہنے لگے کہ صحابۂ کرام کو بجائے ان خیال آرائیوں کے شہسواری اور جانبازی میں طرب و اہتزاز اور راحت و مسرت محسوس ہوتی تھی۔

ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیاء کی بات نکلی تو شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سلطان محی الدین عالمگیرؒ کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جد و جہد نہ ہوتی تو ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ اسلام کو نگل جاتا۔ ـــــــ پاکستان کے بارے میں فرمایا[۱] کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب و تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی، دین و تہذیب حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں، اسلئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے، اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے، ضمناً انھوں نے

---

[۱] یہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پورے دس برس پہلے کی بات ہے۔

اسلام کے نظام زکوٰۃ اور بیت المال کا بھی ذکر کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کے بارے میں فرمایا کہ میں نے بعض مسلم والیانِ ریاست وحکومت کو غیر مسلموں میں تبلیغ کی طرف توجہ دلائی ... اور مسلمانوں میں بھی دعوت کے کام پر زور دیا ... اور عربی زبان کی ترقی اور ایک عالمی بنک کے قیام کے بارے میں بھی بات چیت کی ... میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کی وکالت کے لئے ایک بلند پایہ انگریزی اخبار بھی ضروری ہے، جس سے ملت کی آواز میں طاقت اور اثر پیدا ہو لیکن افسوس ہے کہ مسلم والیانِ ریاست نے مسئلے کی اہمیت نہیں سمجھی اور نہ انھیں خطرات کا احساس ہوا وہ اپنی تنگ نظری، پست خیالی اور خود غرضی کے وہ بہت شاکی تھے۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ ابھی اس صحبت کو کچھ اور طول دینا چاہتے ہیں، لیکن ہم نے ان کے آرام کے خیال سے اجازت طلبی ہی مناسب سمجھی اور سلام کرکے رخصت ہوئے اور اسی دن یا دوسرے دن لاہور کو چھوڑا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس مجلس میں جب ان سے عربی ترجمہ کی اجازت لی تو وہ بہت خوش ہوئے، اور اس کی اجازت دی میں نے "ضربِ کلیم" کی اپنی بعض پسندیدہ نظمیں پڑھ کر سنائیں تو انھوں نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے عربی ترجمہ کے ارادے کا بھی ذکر کیا چھ ماہ بعد ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو جب ہم نے ان کی خبرِ وفات سنی تو ان کے فن وشخصیت پر کچھ کام کرنے کا عزم اور پختہ ہو گیا، اور میں نے اس سلسلے میں رفیق محترم مولانا مسعود عالم صاحب کو پٹنہ خط لکھا جہاں وہ مقیم تھے ہم دونوں نے ایک دوسرے کی ماتم پرسی کی اور اس ہم میں تعاون کا وعدہ کیا، انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ وہ ان کی حیات وپیغام پر لکھیں اور میں ان کے شعر کو عربی جامہ پہناؤں اس لئے کہ ان کو ترجمہ کے کام سے زیادہ مناسبت نہیں ہے

چنانچہ کام شروع ہوا اور میرے مرحوم دوست نے استاد محب الدین خطیب کی ادارت میں قاہرہ سے نکلنے والے رسالہ "الفتح" میں اقبال پر ایک مؤثر مضمون لکھا، اور میں نے ان کی زندگی پر ایک مقالہ لکھا جو بہت بعد میں حجاز ریڈیو سے نشر ہوا، اس کے بعد تقریباً ۱۰ سال تک تعلیمی اور تصنیفی اشغال کی وجہ سے یہ سلسلہ بند رہا۔

۱۹۵۰ء میں جب حجاز، اور مصر و شام کے سفر کا اتفاق ہوا اور تقریباً ایک سال سے زائد قیام کا موقع ملا تو میں نے اقبال اور ان کے فکر و فن سے متعلق چند مقالات لکھے اور انھیں دار العلوم، اور قاہرہ یونیورسٹی میں پڑھا۔

ایک اور مقالہ ۱۹۵۶ء کے سفر شام میں دمشق میں لکھنے کا اتفاق ہوا جو "محمد اقبال فی مدینۃ الرسول" کے عنوان سے دمشق ریڈیو سے نشر ہوا، لیکن اقبال کے ترجمہ پر آمادگی نہیں ہو پاتی تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر عبد الوہاب عزام نے اس کام کو شروع کیا تھا، جو اپنی عربی فارسی لیاقت، اور اقبال سے فکری تعلق کی بنا پر اس کے لئے بہت موزوں بھی تھے، بعد میں ان کے تراجم کے کئی مجموعے سامنے آئے،[1] لیکن میرے بعض دوستوں نے کہا کہ ترجمہ میں اصل کا زور اور تاثیر نہیں، اس لئے فکر اقبال کی واضح نقش آرائی اس سے نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اقبال کی شہرت کے شایان شان ہے۔

میں نے بھی ان ترجموں کو جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ترجمہ، علم و فہم اور ان کی نظم میں کوئی خامی نہیں بلکہ اصل خرابی یہ ہے کہ انھوں نے منظوم ترجمہ کا بیڑا اٹھا کر اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا جس سے اصل اور نقل دونوں کی خوبیاں سامنے نہیں آسکیں اور کہیں کہیں ژولیدگی نے اس پر اور اضافہ کر دیا، جو قاری اور ذوق شعری کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

---

[1] انکے نام یہ ہیں رسالۃ المشرق، ضرب الکلیم، انھوں نے اسرار خودی و رموز بے خودی اور جاوید نامہ کے کچھ حصوں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

ان جیسے آدمی کے لئے جو عربی کا ادیب اور فارسی کا زباندان ہے، یہ مناسب تھا کہ وہ فکر اقبال کو ہضم کر کے پھر اسے عربی نثر کا جامہ پہناتے جیسا کہ انھوں نے مصر کے مشہور رسالوں "الرسالہ" "الثقافہ" کے بعض موثر مقالات میں کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر زبان کی خاص فضا، نفسیات اور تعبیرات ہوتی ہیں، جن کی جڑیں اس کی معاشرت اور تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

لفظی ترجمہ اگر ان باتوں سے خالی ہوگا تو اپنا جمال اور اپنی معنویت کھو دے گا۔

اس کے باوجود ڈاکٹر عزام کی خدمت اسلام و ادب کی ایک بڑی خدمت ہے جو ہر قدردانی اور شکر و اعتراف کی مستحق ہے اور خود ان کی عربیت، ان کے حسن طبیعت، عزم و اخلاص اور اسلامی فکر سے محبت کی دلیل ہے، یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں عزام سا ترجمان ملا، اقبال کی روح ان کی اس محنت و محبت سے یقیناً بہت مسرور ہوئی ہوگی اللہ انھیں جزائے خیر دے ——— میں یہ کہہ رہا تھا کہ اپنی متنوع مصروفیات کے سبب ترجمہ کا کام شروع کرنے پر کوئی آمادگی نہیں تھی، لیکن ایک واقعہ نے عزم خفتہ کو بیدار کر دیا اور نشاط تازہ ہو گیا، میں نے دمشق کے موقر رسالہ "المسلمون" میں عربی کے مشہور ادیب علی طنطاوی کا کھلا خط پڑھا جس میں انھوں نے مجھے شعر اقبال کے ترجمہ کی دعوت دی کہ اقبال کا عرب میں تعارف ہو اور ان کی شاعری کے پایہ کو صحیح شکل میں دیکھا جا سکے، انھوں نے لکھا تھا کہ کیا آپ شعر اقبال کے منتخب حصے کا ترجمہ کر کے ہمیں اقبال اور ان کے فکر و عقیدہ کی عظمت کو سمجھنے اور اس کا راز معلوم کرنے کا موقع عنایت کریں گے اس لئے کہ ان کے عربی ترجمے ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار کو پوری طرح نہیں ڈھا سکے ہیں، کیا آپ اس جلیل القدر خدمت کو اپنی خدمات میں شامل کریں گے، اور اس نظروں سے

اوجھل چمن زار کی سیر کا موقع دیں گے یا ہدیۂ شمیم و نکہت بھیج کر اس گلستاں سے محروم لوگوں کو نوازیں گے؟[1]

اس پیشکش کا جواب گرمجوشی سے دیا گیا اور اس نے بجھی اور تھکی ہوئی طبیعت میں از سر نو تازگی و آمادگی پیدا کر دی جسکے نتیجے میں مسجد قرطبۂ کا ایک ہی نشست میں ترجمہ تمام ہوگیا، اور میں نے اپنے اندر ترجمہ کا ایک ایسا اندرونی تقاضہ اور جذبہ محسوس کیا جسکو میں دبا نہیں سکتا تھا، اس کے بعد مسلسل کئی مقالات لکھے گئے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہونچا ہوا ہوں جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی، عطارؒ، اور عارف رومیؒ آداب شریعت کے پاس اور لحاظ، اور ظاہر و باطن کی یکرنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں، اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں، جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے، میں بعض پرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اسکے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر دور میں اس کا قائل رہا کہ وہ اسلامیات کے ایک مخلص طالب علم رہے اور اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے۔[2]

ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں، جو ان کے علم و فن اور پیغام کی

---

[1] المسلمون شمارہ ۷ جلد ۶ [2] مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ کے نام خطوط سے ان کے اخلاق و تواضع اور علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

عظمت سے میل نہیں کھاتے، اور جنھیں دور کرنے کا موقع انھیں نہیں ملا، البتہ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے، میرا خیال ہے کہ پیغام محمدی کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام، اور اس کی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات و فلسفہ کی بے مائگی پر ان کے پختہ عقیدہ سے ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی ہے، اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے، اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں، جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انھیں اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔

آخر میں پھر کہتا ہوں کہ انھیں میں نے اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نوا خواں شاعر پایا اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا، اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں، احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں، اور رگوں میں شجاعتِ اسلامی کی رَو دوڑنے لگی، میری نظر میں یہی انکے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔

یہ کتاب عربی میں میں نے اسی لئے لکھی کہ مشرق اوسط میں مغربی فلسفہ و تہذیب کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات میری نظر میں تھے، اور میں دیکھتا تھا کہ عالم اسلامی و عربی کس طرح جاہلیت قدیمہ و جدیدہ

لہ ان کے مدراس کے خطبات میں جو انگریزی میں RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHT کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور ان کا اردو و عربی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے، بہت سے ایسے خیالات و افکار ملتے ہیں جن کی تاویل و توجیہ اور اہل سنت کے اجماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے، یہی احساس استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی کا تھا، انکی تمنا تھی کہ یہ لکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا۔

کے دوراہے پر آکھڑا ہوا ہے، جہاں ایک طرف حد سے بڑھی ہوئی قومیت ہے تو دوسری سمت اشتمالیت واشتراکیت، ـــــــ اور ان دونوں کا اثر شعر وادب، سیاسی وتجارتی تعلقات آرٹ اور فنونِ لطیفہ تک میں نفوذ کر گیا ہے، لیکن وہاں ایسے اہل قلم نایاب ہوتے جارہے ہیں، جو عالم عربی کے پیغام کو سمجھنے اس کی مخلصانہ خدمت کرتے اور اپنی تمام فکری صلاحیتوں کو اس جاہلیت کے خلاف جنگ میں صرف کر دیتے، جو آسمانی دعوتوں اور اخلاقی قدروں کے لئے پیام موت ہے، جو اس فکری ارتداد کے خلاف صف آرا ہو جاتے جو تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی گرفت میں لیتا جارہا ہے۔

مغربی فکر کی اس مسموم اور مکدر فضا، اور اس دنیا کو (جو اپنی قیمت وصلاحیت، اپنے پیغام اور دعوتی مقام سے بالکل غافل ہو چکی تھی) پیش نظر رکھتے ہوئے، اس شاعر کی قیمت وعظمت یقیناً بہت بڑھ جاتی ہے، جو گہوارۂ اسلام سے بہت دور ایک نومسلم برہمن خاندان، اور ایسے ملک میں پیدا ہوتا ہے، جہاں فرنگ اور فرنگی تہذیب کی حکومت ہو، وہ عصری اور مغربی علوم وفنون کے بڑے سے بڑے مرکزوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے، مگر پیغام محمدی پر اس کا ایمان مضبوط ہی ہوتا چلا جاتا ہے، محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ان کی امت کی صلاحیت اور اس کے مستقبل پر اعتماد بڑھتا ہی چلا جارہا ہے، اسلامیت کی حمیت اور مغربی فلسفہ وتہذیب سے نفرت اس کی طبیعت بن جاتی ہے، اور وہ اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو اپنی فکر وعقیدہ کی راہ میں لگا دیتا ہے، اور صاحب ایمان شاعری، داعیانہ نظر اور فلسفیانہ پختہ کاری کی علامت بن جاتا ہے، اور اپنے افکار کی ضرب سے برصغیر کے بحر منجمد میں ایک شورش وطوفاں پیدا کر دیتا ہے جس کی لہریں بحر ہند سے گزر کر ساحل عرب اور عالم اسلام کی سرزمین سے ٹکراتی ہیں ـــــــ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہی وہ بہترین فکری ہدیہ ہے،

جو ہم اسلام کی نئی نسل اور اٹھتے اور ابھرتے ہوئے جوانانِ عرب کو دے سکتے ہیں، میں یہ کتاب پیش کرتے ہوئے امیدوار ہوں کہ شاید اس سے عزم و ارادہ کو حرکت میں لانے، طبیعتوں کا جمود توڑنے، سوئی ہوئی غیرت و حمیت کو جگانے کا کوئی سامان اور فکر و ادب کو نیا موڑ دینے کا کوئی رجحان ضرور پیدا ہو گا۔

واللہ من وراء القصد



شاعر اسلام اقبالؒ

حیات و خدمات

اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے' ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا خاندان تھا، ان کے جد اعلیٰ دو سو سال قبل اسلام لائے تھے، اور اسی وقت سے صلاح و تقویٰ کا رنگ خاندان میں قائم رہا، خود اقبال کے والد ایک صوفی صافی انسان تھے۔

اقبال کی انگریزی تعلیم اپنے شہر کے اسکول میں ہوئی جہاں کا امتحان امتیاز سے پاس کر کے وہ شہر کے کالج میں پڑھنے لگے جہاں سید میر حسن ایسے کامل استاد سے سابقہ پڑا جو اپنے تلامذہ میں اپنا رنگ اور علمی ذوق پیدا کر دینے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اقبال بھی ان سے متاثر ہو کر علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ ہوئے، اور آخر عمر تک ان کا احسان نہ بھلا سکے۔

سیالکوٹ سے لاہور جا کر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور فلسفہ، عربی اور انگریزی مضامین اختیار کر کے بی، اے، کی سند لی۔ وہیں مسٹر آرنلڈ اور سر شیخ عبدالقادر (مدیر مخزن) سے متعارف ہوئے، ۱۹۰۱ء میں اقبال کی نظم "چاند" اور دوسری نظمیں "مخزن"

میں شائع ہوئیں، جو ادبی حلقوں میں ایک نئی آواز سمجھی گئیں، اور نوجوان شاعر کی طرف تحسین کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔

اسی عرصے میں اقبال نے فلسفہ میں امتیاز کے ساتھ ایم۔اے، کیا اور تاریخ، فلسفہ و سیاسیات کے لکچرر کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں ان کا تقرر ہوا پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے استاد مقرر ہوئے، جہاں طلبہ اور اساتذہ نے ان کی علمیت و فضیلت کا لوہا مان لیا اور انھوں نے محکمۂ تعلیم کے ذمہ داروں کا اعتماد حاصل کیا۔

وہ ۱۹۰۵ء میں کیمبرج میں داخل ہوئے اور فلسفہ و معاشیات کی امتیازی ڈگریاں پاکر تین سال تک لندن میں قیام پذیر رہے، اور اس عرصے میں اسلامی موضوعات پر خطبات و مقالات کا سلسلہ بھی جاری رہا جس سے ان کی شہرت و مقبولیت علمی حلقوں میں پہلے ہی بڑھ گئی۔ اس مدت میں پروفیسر آرنلڈ کی غیر موجودگی میں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے اور میونخ جاکر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ حاصل کی اور پھر لندن آکر قانون کا اعلیٰ امتحان پاس کرکے کامرس کالج لندن میں استاد ہوگئے، اور پھر سیاسیات و اقتصادیات میں امتیاز پیدا کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں عازمِ وطن ہوئے اقبال جب سسلی سے گزرے تو اسے اشک حسرت سے سیراب کرتے ہوئے گزرے۔

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

یہ سارے امتیازات اقبال کو کل ۳۲۔۳۳ سال کی عمر ہی میں حاصل ہوئے واپسی پر دوستوں اور قدردانوں نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا اقبال نے وکالت شروع کی لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ان کو راس نہ آئی نہ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، ان کے

اکثر اوقات غور و فکر تصنیف یا سخن سنجی میں صرف ہوتے تھے، وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اسی کے ایک جلسے میں انھوں نے "شکوہ" اور دوسرے جلسہ میں جواب شکوہ" پڑھی جو ایک قومی نظم کی حیثیت اختیار کر گئی اور جسے بے مثال قبول عام حاصل ہوا، اور یہ صحیح بھی ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے وہ بہترین نظمیں تھیں۔

انہی دنوں آپ نے "ترانۂ ہندی" اور "ترانۂ ملی" لکھا دونوں ترانوں نے ضرب المثل شہرت و مقبولیت پائی اور دونوں قومی اور ملی محفلوں کے افتتاح کے لئے قومی ترانہ سمجھے جانے لگے[1]۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں طرابلس و بلقان کی جنگوں نے اقبال پر اپنا شدید اثر ڈالا اور ان کے قلبی احساسات کو ایک کاری زخم لگا جس نے مغربی تہذیب اور یورپی سامراج سے شدید نفرت کی شکل اختیار کر لی ان کے رنج والم نے ان سے وہ پر جوش نظمیں کہلوائیں جو مسلمانوں کے غم میں گرم آنسو اور مغرب کے خلاف تیر و نشتر تھیں۔

بغاوت و انقلاب کی یہ روح ان کی اس زمانے کی تمام ہی نظموں میں جاری و ساری ہے، بلاد اسلامیہ، وطنیت، ہلال عید، مسلم، فاطمہ بنت عبداللہ (جو جہاد طرابلس و محاصرۂ ادرنہ میں شہید ہوئی) صدیق رض، بلال رض، تہذیب حاضر، دین، اور حضور رسالت مآب میں ان نظموں میں انھوں نے مسلمانوں کے ان قائدین و زعماء کے رویے پر افسوس

---

[1] جواہر لال نہرو کے بارے میں سننے میں آیا کہ وہ اسے قومی ترانہ بنانا چاہتے تھے، لیکن تقسیم ہند کے بعد بدقسمتی سے اقبال پاکستان کے اور ٹیگور ہندوستان کے قومی شاعر سمجھے جانے لگے اور ٹیگور کا ترانہ قومی ترانہ بنا۔ (مترجم)

ظاہر کیا ہے، جو اسلامی قیادت کے دعویدار ہیں، مگر حضرت رسالت مآبؐ سے انھیں کوئی قلبی اور روحانی رابطہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں ان تمام لیڈروں سے بری ہوں جو یورپ کے لئے شدرحال تو کرتے ہیں، لیکن وہ آپؐ سے ناآشنا ہیں نہ کسی گہرے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائرین حریم مغرب، ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

شاعر عالم خیال میں بارگاہ رسالت میں حاضری دیتا ہے تو حضور رسالت مآبؐ سوال فرماتے ہیں ہمارے لئے کیا ہدیہ لائے ہو شاعر نے جو نذرانہ پیش خدمت کیا وہ اسکے شعروں سے ظاہر ہے ؎

نکل کے باغ جہاں سے برنگِ بو آیا — ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں!

پھر اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں جب یورپ میں جنگ عظیم کا لاوا پھوٹا اور عالم اسلام پر جو حالات و حوادث گزرے انھوں نے ان کو دردمند شاعر، مجاہد داعی، فلسفی حکیم اور دیدہ ور مبصر بنا دیا جو حالات سے مستقبل کا اندازہ لگا لیتا اور پیشگوئی کرتا اور حقائق و عبر کو نظم کا لباس پہناتا، اپنی آتش نوائی اور شعلہ نفسی سے ایمان و یقین، خودی اور بے جگری کی آگ بھڑکاتا تھا۔
اس زمانے میں ان کے سینے کا جوش، دل کا فیضان، اور طبیعت کا سیلان

اپنے عروج پر تھا، اس وقت انھوں نے جو نظمیں کہیں ان میں خضر راہ گل سرسبد کا حکم رکھتی ہے، جس کا ہر قطعہ شعر و ادب، دروں بینی اور حقیقت شناسی کا شاہکار ہے، لیکن "طلوع اسلام" بیت الغزل کا حکم رکھتا ہے جس کی مثال اسلامی ادب میں مشکل سے کہیں اور مل سکے گی۔

بانگ درا ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آئی اور جب سے ابتک اردو کے افق پر اس کا ستارہ غروب نہیں ہوا۔ اس کی آواز صدائے صحرا، اس کی اشاعت کے بعد کا دور ان کی وفات تک فکری پختگی اور دائرہ علم کی وسعت و بیکرانی کے لئے مشہور ہے، اسی دور میں انکے نصب العین اور دعوت و پیغام میں وضاحت و قطعیت پیدا ہوئی، اور انکے فارسی مجموعۂ کلام سامنے آئے۔

انھوں نے فارسی کو اپنے اظہار خیال کے لئے اسلئے ترجیح دی کہ اردو کے مقابلے میں اس کا دائرہ وسیع تھا، اور عربی کے بعد عالم اسلام کی وہ دوسری زبان کا درجہ رکھتی تھی، ایران و افغانستان کی تو وہ مادری زبان ہی تھی، اور اب بھی ہند و بیرون ہند میں اسکے ذوق آشنا بہت ہیں اور اس کا اثر ترکستان، روس اور ترکی تک پھیلا ہوا ہے اس دور میں ان کے اردو مجموعوں کے علاوہ فارسی میں اسرار خودی و رموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، مسافر شائع ہوئیں مدراس لکچرز (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) اور کیمبرج کے لکچر اس کے بعد شائع ہوئے جن پر اہل ادب اور ارباب مذہب و فلسفہ نے یکساں طور پر توجہ کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا، اور متعدد زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوا، نکلسن نے اسرار و رموز کا انگریزی ترجمہ کیا اور جرمنی و اطالیہ میں ان کے شعر و پیام پر غور و فکر کے لئے ان کے نام سے اکیڈمیاں قائم ہوئیں، ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے پہلی بار پاکستان کا نظریہ پیش کیا اور پنجاب کے مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے

اور ۱۹۳۱ء-۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی لندن میں انھیں فرانس، اسپین اور اٹلی کی حکومتوں نے ملکی دورے کی دعوت دی چنانچہ آپ موخرالذکر دونوں ملکوں کی دعوت پر گئے اور میڈرڈ میں اسلامی آرٹ" پر چند خطبات دیئے، مسلمانوں کی صدیوں کی جلاوطنی کے بعد مسجد قرطبہ میں پہلی بار نماز پڑھی اور عربوں کی ۸ سو سالہ حکومت اور ان کے اقبال رفتہ کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روئے اور دل کے پھپھولے پھوڑے، اقبال نے اپنی نظم میں اپنے احساسات اور سچے جذبات کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس میں اسلامی اندلس کی تہذیبی روح، اور اس کے ماضی کا عطر کھینچ آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہوں کے سامنے عظمت رفتہ کی تمام تصویریں آکھڑی ہوئی ہیں، مسجد قرطبہ اپنی ویرانی کی فریاد کر رہی اور نمازیوں کے سجدۂ پر شوق کو ترس رہی ہے، قرطبہ کی فضائیں اذان کی صداؤں کے لئے گوش بر آواز ہیں اور اندلس عہد اسلامی کی یاد میں ابتک سوگوار ہے، اس نظم میں اقبال کے فکر و فن اپنی معراج پر ہیں اور وہ عالمی ادبیات عالیہ میں شمار ہونے کے لائق ہے، اسپین میں اقبال کا پر جوش استقبال ہوا تھا، اسی طرح اٹلی میں بھی موسولینی نے ان کی پذیرائی کی جو ان کی کتابیں پڑھے ہوئے اور ان کے فلسفہ سے واقف تھا، اس لئے دیر تک آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔

حکومت فرانس نے ان کو شمالی افریقہ کی مستعمرات کی سیر اور پیرس کی مسجد آنے کی دعوت دی لیکن غیرت مند مسلمان شاعر نے دعوت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ یہ تو دمشق کی دردناک تباہی کی حقیر قیمت ہے۔

یورپ کے دوران قیام انکے دوستوں اور قدردانوں نے کیمبرج، روم، سوربون، میڈرڈ یونیورسٹی اور رومن رائل سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں جلسے کئے، واپسی میں آپ بیت المقدس کی موتمر اسلامی میں شریک ہوئے اور اثنائے راہ میں اپنی پر اثر نظم "ذوق و شوق" کہی۔

۱۹۳۳ء میں شاہ نادرخاں شہیدؒ کی دعوت پر اس علمی وفد کے ساتھ افغانستان گئے جس میں سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی شریک تھے، بادشاہ نے بہت اخلاص کے ساتھ رازدارانہ گفتگو کی اور اپنا دل کھول کر رکھ دیا، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دیر تک گفتگو کرتے اور روتے رہے، سلطان محمود غزنویؒ اور حکیم سنائی کے مزار پر پہنچ کر ان کا جذبۂ بے اختیار پھر اشک حسرت کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے نظم کا لباس پہنا اس سفر کے تاثرات "مسافر" میں جھلکتے ہیں۔

اقبال عرصے سے طرح طرح کے امراض و عوارض کا شکار چلے آرہے تھے، بالآخر انکی صحت نے جواب دیدیا اور وہ صاحب فراش ہو گئے، لیکن اس حال میں بھی شعر گوئی، تصانیف اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ان دنوں کے مشاغل میں قومیت کے نظریہ کی تردید ان کی تحریروں کا بہت نمایاں حصہ ہے، انہی دنوں آپ نے یہ قطعہ کہا تھا۔

بہشتے بہر پاکان حرم ہست　　بہشتے بہر ارباب ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

انتقال اپنی وفات سے ۱۰ منٹ پہلے وہ قطعہ کہا جو شوق و حسرت کا بیان اور ان کی زندگی کا ترجمان ہے

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید!
سر آمد روزگار این فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید!

اور پھر اپنا آخری لافانی شعر کہا۔

نشانِ مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

یہ آخری دلیل تھی جو انھوں نے صداقت اسلام، اور مومن کے ایمان و یقین پر قائم کی

اور اپنے بوڑھے وفادار خادم کی گود میں آخری سانس لی۔ اور عالم اسلامی میں پھیلے ہوئے دوستوں، شاگردوں اور قدر دانوں سے منہ موڑ کر اور ان کو سوگوار چھوڑ کر دین و ادب کا آفتاب عظمت و اقبال جس نے دلوں کو حرکت و حرارت روشنی اور گرمی عطا کی تھی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کا آفتاب نکلنے سے پہلے غروب ہو گیا۔[1]



---

[1] یہ مقالہ [illegible] کو سعودی ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔

اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر[1]

اقبال کی شخصیت کے وہ تخلیقی عناصر جس نے اقبال میں ایک مخصوص قسم کی گوناگونی رنگا رنگی پیدا کر دی، اور جس نے اقبال کو اسکے ہم عصروں سے زیادہ دل آویز، باعث کشش اور جاذب نظر بنا دیا چند ایسے عناصر ہیں، جن کا تعلق اقبال کی علمی وادبی اور تعلیمی کوششوں سے بہت ہی کم ہے، اقبال کی شخصیت میں جو جامعیت، بلندی فکر و خیال، سوز، درد، کشش اور جاذبیت نظر آتی ہے، ان کا تعلق اقبال کی زندگی کے اس رخ سے ہے جسے ہم یقین و ایمان کہتے ہیں۔

---

[1] یہ مقالہ ۲۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو قاہرہ کے مشہور تعلیمی مرکز اور دانش گاہ دار العلوم میں پڑھا گیا، جو اپنی بہت سی خصوصیات کے لئے مشہور ہے، اور جس کے فضلاء میں شیخ حسن بنا مرحوم و سید قطب شہید تھے، کالج کی تعلیمی فضا اور طلباء، اساتذہ کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں علامہ اقبال کے تعلیمی اور تربیتی عناصر کا تجزیہ اور ان کی شخصیت کا ارتقاء پیش کیا گیا۔ یہ مقالہ بڑے ذوق و شوق اور جوش و خروش کے ساتھ سنا گیا۔

دراصل اقبال کی شخصیت کے بنانے، سنوارنے اور پروان چڑھانے میں عصر حاضر کے صرف ان تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کا ہاتھ نہیں ہے، جن میں کہ اقبال نے داخل ہو کر علوم عصریہ اور مغربی تعلیم حاصل کی، اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال علوم جدیدہ اور مغربی تعلیم کا حصول ہندوستان انگلستان اور جرمنی میں ماہر اساتذہ سے کرتے رہے، اور وہاں کے علم و فن کے چشموں سے سیراب ہوتے رہے، یہاں تک کہ وہ عالم اسلامی میں مغربی علوم و افکار اور تہذیب و تمدن کے ماہرین میں منفرد شخصیت کے مالک ہو گئے، مغربی فلسفہ واجتماع، اخلاق اور سیاست و معیشت میں یورپ کے ایک متخصص کی حیثیت حاصل کی، اور علوم جدید و قدیم میں بڑی گہری نگاہ حاصل کی لیکن اگر اقبال اس مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتے اور موجودہ تعلیمی اداروں کے پھلوں سے استفادہ کے بعد مطمئن ہو کر صرف اس حلاوت و مزہ سے لطف اندوز ہوتے رہتے تو پھر آج وہ ہمارا موضوعِ گفتگو نہیں بن سکتے تھے، اور نہ ادب اسلامی اور تاریخ ادب اسلامی ان کے شعر و ادب کے نغموں سے گونجتی رہتیں، اور نہ علمی صدارت، فکری امامت اور اسلامی ذہن ان کے لئے اپنا دامن وسیع کرتا، اور نہ انھیں اس بلند مقام پر بٹھا کر فخر محسوس کرتا، اس کے لئے بڑی باریک اور بلند شرطیں ہیں، کوئی شخص محض درس و تدریس علوم میں تنوع اور کثرتِ تالیف و تصنیف کی وجہ سے اس مقام بلند تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ اقبال اگر ان تعلیمی اداروں سے استفادہ کے بعد مطمئن ہو جاتے اور انھیں علوم و فنون کی علمی موشگافیوں میں اپنی دلچسپیوں کو محدود رکھتے تو زیادہ سے زیادہ فلسفہ، معاشیات، ادب اور تاریخ میں ایک ماہر استاد اور پروفیسر کی جگہ پاتے یا ایک بڑے پایہ کے مصنف علوم عصریہ کے ماہر فن، صاحب اسلوب ادیب یا ایک اچھے شاعر ہوتے، اور بس! یا پھر ایک کامیاب بیرسٹر، ایک اچھے جج یا حکومت کے ایک اچھے وزیر بنائے جاتے لیکن

آپ یقین کیجئے اگر اقبال ان میں سے کچھ بھی ہوتے تو زمانہ انھیں ویسے ہی بھلا دیتا جس طرح دنیا کے ان بڑے بڑے علماء، ادبار، شعراء، مصنفین، اور حکومتوں کے وزرار کو کہ جن زمانے نے گوشۂ عزلت و گمنامی میں ڈال رکھا ہے، اور آج کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے؟ اور کیا تھے؟ لیکن اقبال کی ذہانت و عبقریت، ان کا زندۂ جاوید پیغام اور ان کی ذہنوں اور دلوں کی تسخیر کرنے کی طاقت و کشش ———— اِن تمام فضائل اور بلندیوں کا سبب ان دنیاوی تعلیمی اداروں سے جُدا، ایک دوسرا تعلیمی ادارہ ہے، جس میں کہ اقبال نے تعلیم و تربیت حاصل کی بڑھے اور پروان چڑھے۔

میرا خیال ہے کہ آپ میں سے اکثر کا ذہن اس مخصوص "ادارہ" کی تلاش و جستجو میں پریشان ہوگا، اور آپ اس کے جاننے کے لئے بے چین ہوں گے کہ آخر وہ کون سا ادارہ ہے جس نے اس "عظیم شاعر" کو پیدا کیا؟ اور وہ کون سے علوم ہیں جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں؟ کس زبان میں وہاں تعلیم ہوتی ہے؟ اور کیسے معلم وہاں تعلیم دیتے ہیں؟ بلاشبہ اس میں اعلیٰ درجے کے نگراں اور مربی ہونگے، جو ایسی ہی عظیم شخصیتیں پیدا کرتے ہیں، (جیسے کہ اقبال تھے) مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اسکے وجود اور محل و مقام سے واقف ہوجائیں تو پھر ضرور اس میں داخلہ کی کوشش کریں گے اور اپنی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے آپ کو اس بے نظیر و بے مثال ادارہ کے سپرد کردیں گے۔

وہ ایک ایسا "ادارہ" ہے کہ جس نے اس میں تعلیم و تربیت حاصل کی، اس کی ناکامی کا کوئی سوال نہیں، جو وہاں سے نکلا وہ ضائع نہیں ہوسکتا، وہ ایک ایسا ادارہ ہے کہ جہاں سے صرف ائمۂ فن، مجتہدینِ فکر، واضعینِ علوم، قائدینِ فکر و اصلاح، اور مجددینِ امت ہی پیدا ہوتے ہیں، وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس کے سمجھنے میں عام مدارس و یونیورسٹیوں کے طلباء و

اساتذہ مشغول رہتے ہیں، ان کی لکھی ہوئی چیزیں درس کے طور پر پڑھی پڑھائی جاتی ہیں انکی تصنیفوں کی شرحیں لکھی جاتی ہیں، ان کے اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے، ان کے ثابت شدہ نظریات کی تائید و تشریح ہوتی ہے، ان کے ایک ایک لفظ پر کتابیں لکھی جاتی ہیں اور انکی ایک ایک کتاب سے پورا پورا کتاب خانہ تیار ہو جاتا ہے، وہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں تاریخ پڑھائی نہیں جاتی بلکہ تاریخ بنائی جاتی ہے، وہاں افکار و نظریات کی تشریح و توضیح نہیں ہوتی بلکہ افکار و نظریات وضع کئے جاتے ہیں، آثار و نشانات کے کھوج نہیں لگائے جاتے بلکہ وہاں سے آثار و نشانات پیدا ہوتے ہیں، یہ ادارہ اور مدرسہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا ہے، یہ دراصل ایک داخلی مدرسہ ہے، جو ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور ہر انسان اسے اٹھائے ہر مقام پر لئے پھرتا ہے، وہ دل کا مدرسہ اور ضمیر و وجدان کا دبستان ہے، وہ ایک ایسا مدرسہ ہے جہاں روحانی پرداخت اور الٰہی تربیت ہوتی ہے۔

اقبال نے اس ادارہ سے اسی طرح تکمیل کی جس طرح دوسرے بہت سے وہبی انسان اس عظیم ادارہ سے تعلیم و تربیت کے بعد نکلے اقبال کی سیرت و شخصیت اس کا علم و فضل اور اخلاق، یہ سب کا سب رہون منت ہے، اسی قلبی دبستان کا جس میں کہ اقبال نے برسوں زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، اقبال کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کرتا ہے کہ خارجی مدرسہ کی بہ نسبت داخلی مدرسہ نے اس کی زندگی میں ایک وجد و سوز، تب و تاب اور ایک نئی قوت و توانائی بخشی، اگر وہ اپنے داخلی مدرسہ میں تعلیم و تربیت حاصل نہ کرتا تو پھر نہ اس کی یہ جاذب نظر شخصیت ہی ظاہر ہوتی، اور نہ اس کا شعور و وجدان اس قدر شعلۂ جانسوز نظر آتا، اور نہ اس کا آتشیں پیام قلب و نظر کے لئے سوز جاودان ثابت ہوتا اقبال کے کلام میں اس ادارہ کے اساتذہ و معلمین اور مربین کا ذکر و اعتراف بہت ہی

کثرت سے ملتا ہے۔

وہ تخلیقی عناصر جنھوں نے اقبال کی شخصیت کو بنایا، بڑھایا اور پروان چڑھایا وہ دراصل اقبال کو اپنے داخلی مدرسہ میں حاصل ہوئے، یہ پانچ تخلیقی عناصر ہیں جنھوں نے اقبال کی شخصیت کو "زندۂ جاوید" بنا دیا۔

ان میں سے پہلا عنصر جو اقبال کو اپنے داخلی مدرسہ میں داخلہ کے بعد اول ہی دن حاصل ہوا وہ اس کا "ایمان و یقین" ہے، یہی یقین اقبال کا سب سے پہلا مربی اور مرشد ہے، اور یہی اسکی طاقت و قوت اور حکمت و فراست کا منبع اور سرچشمہ ہے، لیکن اقبال کا وہ یقین و ایمان اس خشک جامد ایمان کی طرح نہیں ہے، جو بے جان تصدیق یا محض جامد عقیدہ ہے، بلکہ اقبال کا "یقین" عقیدۂ و محبت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو اس کے قلب و وجدان، اس کی عقل و فکر، اس کے ارادۂ و تصرف اس کی دوستی و دشمنی غرضکہ اس کی ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت راسخ الایمان تھے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انکی محبت، شغف اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا، اس لئے ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندۂ جاوید دین ہے کہ اس کے بغیر انسانیت فلاح و سعادت کے بام عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم رشد و ہدایت کے آخری مینار، نبوت و رسالت کے خاتم اور مولائے کل ہیں۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

اس دور مادیت اور مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک سے اقبال کی

آنکھیں خیرہ نہ ہو سکیں، حالانکہ اقبال نے جلوۂ دانش فرنگ میں زندگی کے طویل ایام گذارے اس کی وجہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اقبال کی وہی والہانہ محبت، جذبۂ عشق اور روحانی وابستگی تھی، اور بلاشبہ ایک حب صادق اور عشق حقیقی ہی قلب و نظر کے لئے ایک اچھا محافظ اور پاسبان بن سکتا ہے:۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ

رہے ہیں، اور ہیں، فرعون میری گھات میں اب تک — مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں — کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

علامہ اقبال نے اپنی کتاب "اسرار خودی" میں ملت اسلامیہ کی زندگی کی بنیادوں اور ان ستونوں کے ذکر کے سلسلہ میں جس پر حیات ملت اسلامیہ موقوف ہے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے روحانی تعلق، دائمی وابستگی اور اپنی فداکارانہ محبت کا بھی ذکر کیا ہے، جب وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے، اور نعتیہ اشعار ابلنے لگتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محبت و عقیدت کے چشمے پھوٹ پڑے ہوں، اس سلسلہ میں چند اشعار پیش خدمت ہیں جن سے اقبال کے محبت بھرے جذبات کا قدرے اندازہ ہوگا:۔

در دل مسلم مقام مصطفےٰ است — آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است

بوریا ممنون خواب راحتش — تاج کسریٰ زیر پائے امتش

در شبستان حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشم او محروم نوم — تا بہ تخت خسروی خوابید قوم

وقت ہیجا تیغ او آہن گداز | دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت آمین تیغ او | قاطع نسلِ سلاطین تیغ او
در جہاں آئین نو آغاز کرد | مسندِ اقوام پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد | ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست | با غلام خویش بر یک خواں نشست
در مصافے پیشِ آں گردوں سریر | دخترِ سردار طےؔ آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود | گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبی بے پردہ دید | چادرِ خود پیشِ روئے او کشید
آں کہ بر اعدا دَرِ رحمت کشاد | مکہ را پیغام لا تثریب داد
ماکہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم | چوں نگہ نورِ دو چشیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما | شبنم یک صبح خندانیم ما
مست چشم ساقی بطحا ستیم | در جہاں مثل مے و مینا ستیم
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت | آتش او این خس و خاشاک سوخت
شورِ عشقش در نئے خاموش من | می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
من چہ گویم از تولائش کہ چیست | خشک چوبے در فراقِ او گریست
ہستیِ مسلم تجلی گاہِ اُو | طورہا بالد ز گردِ راہِ اُو

جوں جوں زندگی کے دن گذرتے گئے، اقبال کی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ محبت والفت بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ آخری عمر میں جب بھی ان کی مجلس مین نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا یا مدینہ منورہ کا تذکرہ ہوتا، تو اقبال بے قرار ہو جاتے،

آنکھیں پُرآب ہوجاتیں یہاں تک کہ آنسو رواں ہوجاتے یہی وہ گہری محبت تھی، جو ان کی زبان سے الہامی شعروں کو جاری کردیتی تھی چنانچہ اللہ تعالےٰ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

مکن رسوا حضور خواجہ مارا
حساب من ز چشم او نہاں گیر

یہ شعر محبت وعقیدت کا کتنا اچھا مظہر ہے۔

دراصل علامہ اقبال کا یہی وہ ایمانِ کامل اور حبِ صادق تھی جس نے اقبال کے کلام میں یہ جوش، یہ ولولہ، یہ سوز و گداز پیدا کردیا، اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت عیاں ہوجائے گی، کہ دراصل رقت انگیز شعر، عمیق فکر، روشن حکمت، بلند معنویت، نمایاں شجاعت، نادر شخصیت اور عبقریت[1] کا حقیقی منبع و سرچشمہ محبت و یقین ہی ہے، اور تاریخِ عالم میں جو کچھ بھی انسانی کمالات یا دائمی آثار و نشانات نظر آتے ہیں، وہ سب کے سب اسی محبت و یقین کے مرہونِ منت ہیں، اگر کوئی شخصیت یقین و محبت کے جذبہ سے خالی ہو تو پھر وہ صرف گوشت و پوست کی صورت ہے اور اگر پوری امت اس سے خالی ہے، تو پھر اس کی وقعت بکریوں اور بھیڑوں کے گلے سے زیادہ نہیں، اور اسی طرح اگر کسی کلام میں یقین و محبت کی روح کارفرما نہیں ہے تو پھر وہ ایک مقفیٰ اور موزوں کلام تو ہو سکتا ہے لیکن ایک زندہ جاوید کلام نہیں بن سکتا اور جب کوئی کتاب اس روح سے خالی ہو تو اس کتاب کی حیثیت مجموعۂ اوراق سے زیادہ نہیں ہوگی اور اسی طرح اگر کسی عبادت میں محبت و یقین کا جذبہ شامل نہیں ہے

---

[1] عبقریت (GENIUS) کا عربی ترجمہ ہے۔

تو پھر وہ ایک بے روح ڈھانچہ ہے، غرضیکہ پوری زندگی اگر محبت ویقین کے جذبہ سے خالی ہے تو پھر وہ زندگی نہیں، بلکہ موت ہے، اور پھر ایسی زندگی کیا؟ جس میں طبیعتیں مردہ وافسردہ ہوں، نظم ونثر کے سرچشمے خشک ہوں، اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہوں، ایسی حالت میں یقینِ کامل اور حبِ صادق ہی حیاتِ انسانی میں جلا پیدا کرتی ہے، اور انسانی زندگی نور ورنگ سے معمور ہو جاتی ہے، پھر شستہ، پرسوز پر درد، روح نواز اور جاں بخش کلام سننے میں آتے ہیں، خارقِ عادت شجاعت وقوت دیکھنے میں آتی ہے، اور علم وادب کے نقوش بھی زندۂ جاوید بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہی محبت اگر پانی، مٹی اور اینٹ پتھر میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی زندۂ جاوید بنا دیتی ہے، ہمارے سامنے اس کی روشن مثال مسجد قرطبہ، قصرِ زہرا اور تاج محل ہیں، سچ تو یہ ہے کہ محبت ویقین کے بغیر ادب وفن مردہ وافسردہ وناتمام ہیں:۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

بڑی غلط فہمی میں وہ لوگ مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ علم حضرات اپنی قوتِ علم، کثرتِ معلومات اور ذکاوت وذہانت کی وجہ سے ایک دوسرے سے سبقت لیجاتے ہیں یا ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں، اور اسی طرح شعراء کو ان کی فطری قوتِ شاعری الفاظ کا حسنِ انتخاب، معانی کی بلاغت، انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے، اور مصلحینِ وقت اور قائدینِ ملت کی بلندی وپستی موقوف ہے ان کی ذہانت کی تیزی، خطابت کی بلندی، سیاسی سوجھ بوجھ اور حکمتِ عملی پر! حالانکہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی فضیلت وبلندی کا دار ومدار محبت واخلاص پر ہے، ان کی سچی محبت

اور مقصد سے اخلاص کامل ہی ان کی عظمت و بزرگی کا سبب ہے اس لئے کہ اس کا مقصد، موضوع اور غرض و غایت اس کی روح میں سرایت کر جاتی ہے، قلب میں جاگزیں ہو جاتی ہے، اور فکر و عمل پر چھا جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذاتی خواہش مغلوب اور شخصیت تحلیل ہو جاتی ہے، اب وہ جب کوئی بات کرتا ہے تو مقصد کی زبان سے کرتا ہے، جب کچھ لکھتا ہے، تو مقصد کے قلم سے لکھتا ہے غرضیکہ اس کے فکر و خیال، دل و دماغ اور اس کی پوری زندگی پر اس کا مقصد چھا جاتا ہے۔

لیک عظیم گناہ جو اس جدید تمدن کا پیدا کردہ ہے، وہ ہے مادہ پرستی اور پھر اس سے نفع پسندی، جنسی محبت اور نفسانی خواہش! جو درحقیقت جدید عصری مادی تعلیم کا ثمرہ ہے، جس نے ہماری نئی نسلوں کو تباہ کر رکھا ہے، اور آج حال یہ ہے کہ ان کے قلوب ایمان کی حرارت، حبِ صادق کی تپش اور یقین کے سوز سے خالی ہیں، اور یہ عالم نو ایک ایسی متحرک شے بن کر رہ گیا ہے کہ جس میں نہ کوئی زندگی ہے، اور نہ کوئی روح، نہ شعور و وجدان ہے، نہ مسرت و غم کا احساس! اس کی مثال اس جامد شے کی طرح ہے، جو کسی جابر و قاہر شخص کے دستِ تصرف میں ہو، وہ جس طرح چاہے اسے حرکت دے اور استعمال کرے۔

جب آپ اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اقبال کا کلام ہمارے جانے پہچانے شعراء سے بہت کچھ مختلف ہے، اقبال کا کلام ہمارے شعور و احساس قلب و وجدان اور اعصاب میں حرکت و حرارت، سوز و گداز، درد و تپش پیدا کرتا ہے، اور پھر ایک ایسا شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں، فاسد معاشرہ اور باطل قدروں کے ڈھیر، جل کر فنا ہو جاتے ہیں، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کس قدر طاقت ور ایمان، پُر درد و پُرسوز سینہ اور بے چین روح

رکھتا ہے، قابلِ صد ستائش ہے وہ دوسرا مدرجس نے اتنی اچھی تربیت کی اور ایسی قابل قدر شخصیت تیار کی۔

اقبالؒ کی شخصیت کو بنانے والا دوسرا عنصر وہ ہے جو آج ہر مسلمان گھر میں موجود ہے، مگر افسوس کہ آج خود مسلمان اس کی روشنی سے محروم، اس کے علم و حکمت سے بے بہرہ ہیں، میری مراد اس سے قرآن مجید ہے، اقبال کی زندگی پر یہ عظیم کتاب جس قدر..... اثر انداز ہوئی ہے، اتنا نہ وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں، اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے، اقبال کا ایمان چونکہ "نو مسلم" کا سا ہے، خاندانی وراثت کے طور پر انھیں نہیں ملا ہے اس لئے ان کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن سے شغف، تعلق اور شعور و احساس کے ساتھ مطالعہ کا ذوق بہت زیادہ ہے، اقبال کا قرآن پڑھنا عام لوگوں کے پڑھنے سے بہت ہی مختلف رہا ہے، جیسا کہ خود اقبال نے اپنے قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ روزانہ بعد نماز صبح قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے، اقبال کے والد جب انھیں دیکھتے تو فرماتے کیا کر رہے ہو؟ اقبال جواب دیتے قرآن پڑھ رہا ہوں، کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا آخر ایک دن اقبال نے پوچھا، ابا جان! آپ مجھ سے روزانہ پوچھتے ہیں، اور میں ایک ہی جواب دیتا ہوں اور پھر آپ خاموش چلے جاتے ہیں، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے قرآن اسی وقت تم پر نازل ہو رہا ہے، اس کے بعد سے اقبال نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی ان پر نازل ہو رہا ہے، اپنے ایک شعر میں بھی وہ اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں :۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب ۔۔۔ گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

علامہ اقبالؔ نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گذاری، قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے، قرآن بولتے، قرآن مجید ان کی وہ محبوب کتاب تھی جس سے انھیں نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا، اس سے انھیں ایک نیا یقین، ایک نئی روشنی، اور ایک نئی قوت و توانائی حاصل ہوتی، جوں جوں انکا مطالعہ قرآن بڑھتا گیا، ان کے فکر میں بلندی اور ایمان میں زیادتی ہوتی گئی، اس لئے کہ قرآن ہی ایک ایسی زندۂ جاوید کتاب ہے، جو انسان کو لدُنی علم اور ابدی سعادت سے بہرہ ور کرتی ہے، وہ ایک ایسی شاہ کلید ہے کہ حیات انسانی کے شعبوں میں سے جس شعبہ پر بھی اسے لگائیے، فوراً کھل جائے گا، وہ زندگی کا ایک واضح دستور اور ظلمتوں میں روشنی کا مینار ہے۔

تیسرا عنصر جس کا اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے، وہ "عرفانِ نفس" اور "خودی" ہے، علامہ اقبال نے عرفانِ ذات پر بہت زور دیا ہے، انسانی شخصیت کی حقیقی تعمیر ان کے نزدیک منت کش "خودی" ہے، جب تک عرفانِ ذات نہ حاصل ہو، اس وقت تک زندگی میں نہ سوز و مستی ہے، اور نہ جذب و شوق! اس سلسلہ میں اقبال کے یہ شعران کے فکر کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:-

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

من کی دنیا؟ من کی دنیا، سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

ان کے کلام میں معنوی بلندی کے ساتھ ساتھ لفظوں کی بندش ہم آہنگی، اتار چڑھاؤ روانی و تسلسل، اور موسیقیت اس قدر زیادہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

علامہ اقبال کو خودی کی تربیت اور عرفانِ نفس پر بڑا اعتماد تھا، ان کے نزدیک خود شناسی و خود آگاہی انسان کو اسرارِ شہنشہی سکھلاتے ہیں، عطار ہوں یا رومی، رازی ہوں یا غزالی، بغیر عرفانِ نفس کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی عرفانِ نفس کا نتیجہ تھا کہ اقبال نے اس رزق پر موت کو ترجیح دی جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو اور دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اقبال کے خیال میں زیادہ بہتر ہے جس کی فقیری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خُوبُو اور ان کا اسوہ ہو، اور حق تو یہ ہے کہ عرفانِ نفس اور عرفانِ ذات ہی کے حصول کے بعد انسان جرأت سے اس بات کا اظہار کر سکتا ہے کہ:-

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقبال کا تصورِ خودی خود اقبال میں اس قدر رچ بس گیا کہ ان کی زندگی عرفانِ نفس کا زندہ نمونہ تھی، ان کی زندگی کے اوراق میں ان کی خودی، خودداری، خود اعتمادی کے نقوش بہت ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں، عرفانِ نفس ہی کے لئے دوسروں کو مخاطب کر کے وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک — اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت — فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

بلاشبہ اقبال نے شکم کے مقابلے میں دل کو ترجیح دی، اور دل ہی کو اختیار کیا۔

یہ عرفانِ نفس ہی کا کرشمہ تھا جس نے اقبال کو ہر قسم کی فکری گمراہی اور ادبی بے راہ روی سے محفوظ رکھا، حالانکہ یہی دونوں چیزیں ہمارے عام ادبا و شعرا اور مصنفین کو ہر چراگاہ میں منھ مار لینے، ہر وادی میں بھٹکنے اور ہر موضوع پر لکھنے کے لئے آمادہ کرتی ہیں، خواہ وہ ان کے عقیدہ و خیال کے موافق ہو یا نہ ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک نہ اپنی شخصیت کو پہچانتے ہیں، اور نہ اپنے پیغام سے واقف ہوتے ہیں، لیکن اقبال نے اول ہی دن سے اپنی ذات اور شخصیت کو اچھی طرح پہچانا، اپنی وہبی صلاحیتوں کا صحیح صحیح اندازہ کیا، اور پھر اپنی فکری صلاحیتوں، شعری قوتوں کو مسلمانوں کی زندگی کے ابھارنے ان میں روح و زندگی پیدا کرنے، اور یقین و ایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے میں صرف کیا، اور ان میں قوت و حریت اور سیادت و قیادت کا احساس دلایا، اقبال ایک فطری اور وہبی شاعر تھے، اگر وہ شاعر نہ بننے کی کوشش کرتے تو کامیاب نہ ہوتے، شعر کہنے پر وہ مجبور تھے، ان کی شاعری رستے ہوئے قلب، پرجوش و پرسوز دل، معانی کی معنویت اور الفاظ کی شوکت کی آئینہ دار تھی، وہ ایک قادر الکلام ماہرِ فن شاعر تھے، ان کے ہمعصر شعرا نہ صرف یہ کہ ان کی امامت اور کلام میں اعجاز کے قائل تھے، بلکہ زبان، تراکیب، معانی افکار، جدتِ تشبیہ ہر چیز سے متاثر تھے، ان کی شاعری کو عظیم بنانے میں انگریزی اور جرمن شعر و ادب اور فارسی شاعری کا بھی بڑا دخل ہے، لیکن ان سب باتوں کے عرض کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقبال کے ہمعصروں میں کوئی اچھا اور اونچا شاعر ہی نہ تھا، بلکہ

اچھے سے اچھے اور اونچے سے اونچے ادیب و شاعر موجود تھے، جو اپنے الفاظ کی فصاحت معنی کی بلاغت، استعارہ و تشبیہ کی جدّت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، لیکن جو چیز کہ اقبال کو اپنے ہمعصروں سے ممتاز کردیتی ہے، وہ ہے ان کی شاعرانہ عظمت، ادبی قوت، فنی ذہانت جبلی عبقریت اور ان سب کے ساتھ ساتھ اسلام کا پیغام! اقبال نہ قومی شاعر تھے، اور نہ وطنی، اور نہ عام رومانی شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی شراب و شاہد کی مرہونِ منت تھی، اور نہ ان کی شاعری نری حکمت و فلسفہ کی شاعری تھی، انکے پاس اسلام کی دعوت اور قرآن کا پیغام تھا، جس طرح ہوا کے جھونکے پھولوں کی خوشبو پھیلاتے ہیں، اور جس طرح اس زمانے میں برقی لہروں سے پیغامات کے پہنچانے کا کام لیا جاتا ہے، اسی طرح اقبال بھی اپنے اس پیغام کو شعر کی زبان میں کہتے تھے تاکہ انکے پیغام کے لئے شعر، برقی لہروں کا کام دے، بلاشبہ اقبال کی شاعری نے خواب غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو بیدار کردیا اور ان کے دلوں میں ایمان و یقین کی چنگاری پیدا کردی، تو یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ اقبال نے اپنے آپ کو پہچانا اپنی وہبی شخصیت و قوت کا صحیح اندازہ کیا، اور ان کو اصل مقام پر استعمال کیا

وہ چوتھا عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کو بنایا، پروان چڑھایا، اور اس کی شاعری کو نت نئے معانی، افکار کی جولانی اور قوتِ تاثیر عطا کی، ان میں کتابوں کی درس و تدریس اور مطالعہ کے شوق و انہماک کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اقبال کی آہِ سحر گاہی اس کا اصل سرچشمہ ہے جب سارا عالم خواب غفلت میں پڑا سوتا رہتا اس اخیر شب میں اقبال کا اٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوجانا، پھر گڑگڑانا اور رونا، یہی چیز تھی جو اسکی روح کو ایک نئی نشاط اسکے قلب کو ایک نئی روشنی اور اس کو ایک نئی فکری غذا عطا کرتی پھر وہ ہر دن اپنے دوستوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ایک نیا شعر پیش کرتا، جو انسانوں کو

ایک نئی قوت، ایک نئی روشنی، اور ایک نئی زندگی عطا کرتا۔

اقبال کے نزدیک آہ سحر گاہی زندگی کا بہت ہی عزیز سرمایہ ہے، بڑے سے بڑے عالم و زاہد اور حکیم و مفکر اس سے مستغنی نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اقبال علی الصباح اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے، سفر و حضر ہر مقام اور ہر کہیں ان کیلئے سحر خیزی ضروری تھی:۔

زمستانی ہوائیں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اس کی تمنا بھی کرتے ہیں کہ خداوندا مجھ سے تو جو چاہے چھین لے لیکن لذت آہِ سحر گاہی سے مجھے محروم نہ کر:۔

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

یہی وجہ تھی کہ وہ جوانوں میں اپنی اس آہ و سوز، اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے، اور دعائیں کرتے کہ خداوندا یہ میرا سوزِ جگر اور میرا عشق و نظر آج کل کے مسلم نوجوانوں کو بخشدے

جوانوں کو سوزِ جگر بخشدے
مرا عشق، میری نظر بخشدے

اسی بات کو ایک دوسری نظم میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے   پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے دل سے نکلی ہوئی یہ دعائیں بے اثر نہیں گئیں اور آج سارے عالم اسلام میں خالص اسلامی فکر و نظر لئے، نوجوانوں کی ایک نئی نسل ابھر رہی ہے۔

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

آخری موثر عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کی تخلیق میں اہم حصہ لیا ہے، وہ مولانا جلال الدین رومی کی "مثنوی معنوی" ہے، یہ کتاب مولانا رومی کی مشہور مثنوی ہے، جو فارسی زبان میں وجدانی تاثر اور اندرونی شدت کی بنا پر لکھی گئی ہے، دراصل یونانی فلسفہ عقلیات مولانا روم کے دور میں جس طرح چھا چکا تھا اور کلامی مباحث خشک فلسفیانہ موشگافیاں مسلمانوں کے ذہنوں، دینی مدرسوں اور علمی اداروں میں جس طرح سرایت کر چکی تھیں، اس سے ہٹ کر کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر مولانا روم نے مثنوی لکھنی شروع کی جو اپنے اندر قوتِ حیات کے ساتھ ساتھ ادبی بلندی معانی کی جدت، حکیمانہ مثالوں اور نکتوں کے بیش بہا خزینے سمیٹے ہوئے ہے، اس کتاب نے اس دور سے لے کر آج تک ہزاروں انسانوں کو متاثر کیا ہے ان کے قلب و نظر میں تبدیلی کی ہے، اسلامی کتب خانے میں اپنے انداز پر یہ ایک بے نظیر و بے مثال کتاب ہے، اس دورِ جدید میں، جبکہ اقبال کو یورپ کے مادی و عقلی، بے روح و بے خدا افکار و خیالات سے سابقہ پڑا، اور مادہ و روح کی کشمکش اپنے پورے عروج کے ساتھ سامنے آئی تو اس قلبی اضطراب اور فکری انتشار کے موقع پر اقبال نے مولانا روم کی مثنوی سے مدد لی، اس کشمکش میں مولانا روم

نے ان کو بہت کچھ سہارا دیا، یہاں تک کہ اقبال نے پیر روم کو اپنا کامل رہنما تسلیم کر لیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ عقل و خرد کی ساری گتھیاں جسے یورپ کی مادیت نے الجھایا ہے، ان کا حل صرف آتشِ رومی کے سوز میں پنہاں ہے، اور میری نگاہِ فکر اسی کے فیض سے روشن ہے، اور آج یہ اسی کا احسان ہے کہ میرے چھوٹے سے سبو میں فکر و نظر کا ایک بحرِ ذخار پوشیدہ ہے:۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے تیرا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

مولانا روم سے اپنی اس محبت و عقیدت کا اظہار اقبال نے بار بار کیا ہے اور انھیں ہمیشہ "پیرِ رومؒ"[1] کے نام سے یاد کرتے ہیں:۔

صحبت[2] پیرِ روم نے مجھ پہ کیا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

اقبال اس بیسویں صدی کے خالص صنعتی و مادی دور میں پھر کسی رومیؒ کے منتظر ہیں! ان کے نزدیک مادیت کا زنگ عشق کی بھٹی ہی میں صاف ہو سکتا ہے، اور اس کے لئے آتشِ رومی کی ضرورت ہے:۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

---

[1] پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر + کاروانِ عشق و مستی را امیر۔ اقبال   [2] یعنی مطالعہ مثنوی

لیکن اقبال مایوس نہیں ہیں بلکہ اپنے کشتِ ویراں سے بہت ہی پرامید ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنے کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہی وہ پانچ عناصر ہیں جنھوں نے اقبال کی شخصیت کی تخلیق کی، اور یہ عناصر دراصل اسی دوسرے مدرسے کے فیض و تربیت کے نتائج ہیں جس نے اقبال کو مضبوط عقیدہ، قوی ایمان، سلیم فکر اور بلند پیغام عطا کیا، اور جس نے اقبال کو "اقبال" بنایا۔



اقبال اور مغربی تہذیب و ثقافت[1]

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم نوجوانوں میں مغربی تعلیم اور تربیت کا شوق ہوا جس کے نتیجے میں وہ یونیورسٹیوں کا رخ کرنے لگے اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ فاتح قوم کا خوف اور دہشت ان کے دل سے نکل گئی، علمی روابط بڑھے، ثقافتی تعلقات پیدا ہوئے اور مغربی تعلیم گاہوں میں مقیم رہ کر اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کی جانے لگی اور اس طرح مغربی ماہرین کی نگرانی میں انھوں نے مغرب کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا، اور مغربی زندگی کی ہر قدر کو پہچاننے کی کوشش کی۔

فلسفہ، شعر و ادب، اور دوسرے نظام فکر کے ذریعہ مغربی تہذیب کے اسرار و رموز اسکا مادہ پرستانہ مزاج، خود پسند قومیت، اور جانبدارانہ وطنیت کو بھی دیکھا مغربی تہذیب کے دوسرے کمزور پہلو افلاس اقدار اور تہذیب کے زوال کے آثار بھی ان کے سامنے آئے،

---

[1] یہ مضمون مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" سے ماخوذ ہے۔

انھیں ان تعمیری قدروں کا بھی خیال پیدا ہوا جن سے یہ تہذیب خالی تھی، اور اس کے راہنما بھی ان سے غافل تھے، خرابی کی وہ تمام صورتیں ان کی نگاہ میں آئیں جو اس تہذیب کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھیں لیکن شروع سے وہ اس کے بنیادی عناصر اور اسکے خمیر میں موجود تھیں ـــــــ اس ماحول میں ان لوگوں میں فکری بیداری اور کچھ سوچنے اور کام کرنے کا جو حوصلہ پیدا ہوا وہ قیام یورپ کے بغیر ممکن نہ تھا، اس ردعمل کے لئے مغربی فکر و فلسفہ سے گہری واقفیت، جرأت مندانہ نقطۂ نظر، اور غیر تقلیدی ذہن کی ضرورت تھی۔

ایمان کی دبی ہوئی چنگاری آخر جب بھڑکی تو جدید تعلیم یافتہ طبقے میں مغرب کی طرف سے مایوسی پیدا ہوئی اور گہری، صحیح اور جرأتمندانہ تنقید کی طاقت بیدار ہوئی جو مبالغہ اور واقعات وحقائق کے انکار سے خالی تھی۔

اقبال ان باغی ناقدین کی صف اول میں تھے، عالم اسلامی نے اس سو سال میں جدید طبقہ میں شاید ان سے بڑا کوئی دیدہ ور نہیں پیدا کیا بلکہ وہ عصر حاضر کے مشرق کے سب سے بڑے مفکر و فلسفی ہیں، ہم دوسرے تمام مشرقی فضلاء میں مغربی تہذیب پر اقبال کی طرح گہری نگاہ اور ان جیسا جرأت مندانہ تنقیدی نقطۂ نظر ڈھونڈھے سے بھی نہیں پا سکتے۔

اقبال نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا، جو اس کی سرشت اور اس کی طینت میں موجود تھے، انھوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن مذہب اور اخلاقی و روحانی اقدار کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے، انھوں نے فساد قلب و نظر کو اس تہذیب کی روح کی

ناپاکی کا ثمر بتایا ہے جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین لی ہے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب ۔۔۔ کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ۔۔۔ ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

وہ کہتے ہیں کہ تہذیب کی رونق و بہار حکومتوں کی وسعت اور اقتدار کے باوجود اس تہذیب کے زیر سایہ دوامی بے چینی و اضطراب سے چھٹکارا نہیں، برق و بخارات اس کی پوری فضا پر دھند کی طرح چھا گئے ہیں، بجلی کی روشنی ضرور ہے، لیکن اس سے کوئی فکری راہ روشن نہیں ہوتی اور نہ عالم غیب کی نورانیت کی اس میں کوئی جھلک ملتی ہے۔

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت ۔۔۔ دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ۔۔۔ یہ وادیِ ایمن نہیں شایان تجلی

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ ۔۔۔ شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی (یورپ اور یہود)

اقبال نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ لادینی تہذیب کی اساس ہی دین و اخلاق کی دائمی دشمنی پر ہے اور ہر زمانے میں مادیت کے بتکدے میں نئے بت تراشنا اس کا محبوب مشغلہ ہے، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں فرماتے ہیں کہ یہ بے خدا تہذیب ہمیشہ اہل حق کے ساتھ نبرد آزما رہی ہے یہ فتنۂ روزگار حرم میں لات و عزیٰ کے صنم کو جگہ دے کر ہمیشہ نئے نئے فتنے پیدا کرتا رہا ہے قلب اس کے سحر سے بے بصیرت اور روح سراب تشنگی سے ہلاک ہو کر رہ جاتی ہے اس کے دل کی تب و تاب ہی نہیں ختم ہوتی بلکہ قالب ہی اس سے خالی ہو جاتا ہے۔

یہ وہ دزد دلاور ہے، جو دن دہاڑے ڈاکہ ڈالتا اور انسان کو بے روح اور بے قیمت بنا کر رکھ دیتا ہے۔

لیکن از تہذیب لادینی گریز ۔۔۔ زاں کہ او با اہل دل دارد ستیز

فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آورد
لات و عزّیٰ در حرم باز آورد

از فسونش دیدۂ دل نابصیر
روح از بے آبیٔ او تشنہ میر

لذت بے تابی از دل می بَرد!
بلکہ دل زیں پیکرِ گِل می برد

کہنہ دزدے غارت او برملاست

لالہ می نالد کہ داغِ من کجاست [۱]

وہ کہتے ہیں کہ اس تہذیب کا شعار انسانیت کی تباہی، اور نوع بشری کی ہلاکت اور اس کا پیشہ تجارت ہے، مغربی تہذیب کے ہوتے دنیا میں امن واطمینان، پاک محبت، اور خالص خدا پرستی ممکن نہیں :۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست
چشم او ینظر بنور اللہ نیست!

او نداند از حلال و از حرام
حکمتش خام است و کارش ناتمام

امتے بر امتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

وہ اسی مثنوی میں مزید فرماتے ہیں کہ نئی تہذیب کا خاص نشانہ وہی انسان ہے جو اسکی گرمیٔ بازار کا سبب اور اس کی تجارت کا آلۂ کار ہے، یہ بلند معیار زندگی اور بڑھتے ہوئے مصارف ان چالاک یہودیوں کے مکر کی پیداوار ہیں جس نے بنی آدم کے دل سے حق کی روشنی چرالی ہے، عقل، تہذیب، اور دین و مذہب اس وقت تک محض خواب ہیں، جب تک یہ موجودہ نظام سرے سے نہیں بدل دیا جاتا :۔

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است

---

[۱] پس چہ باید کرد۔ ۱۳

ایں بنوک ایں فکر چالاکِ یہود   نورِ حق از سینۂ آدم ربود!
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام   دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

وہ فرماتے ہیں کہ تہذیب حاضر اپنی عمر کے لحاظ سے جوان ہے، لیکن درحاصل عالم نزع میں موت کی ہچکیاں لے رہی ہے:۔

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی!

اور اگر وہ اپنی طبعی موت نہیں مرسکتی تو اپنے ہی خنجر سے اپنا کام تمام کرلے گی شاخ نازک پر جو آشیانہ بنے گا وہ ضرور ناپائدار ہوگا، اس تہذیب کی اساس نہایت کمزور و ناستحکم ہے، اس کی بتوریں دیواریں حالات و حوادث کے سنگین حملوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، یورپ کی سائنسی تحقیقات خود مغرب اور انسانیت کے لئے چیلنج بن گئی ہیں۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اسکا آشیانہ

اس دنیا سے ایک نئی دنیا نکلنے کے لئے بیقرار ہے، اور وہ پرانی دنیا (جسے فرنگیوں نے امن عالم اور عزتِ بنی آدم کو داؤں پر چڑھانے کے لئے قمار خانہ بنا رکھا تھا) آخری سانس لے رہی ہے۔

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

یہ تہذیب اپنے اندر بڑی چمک دمک رکھتی ہے، اور اس کا شعلہ حیات بہت

روشن ہے، لیکن اس میں کوئی موسیٰؑ نہیں جو خدائی کلام والہام سے مشرف ہوتا۔اس میں کوئی ابراہیمؑ بھی نہیں جو بت شکن بنتا اور آگ کو گلزار بنا دیتا۔

اس تہذیب میں عقل پروان چڑھتی ہے لیکن محبت اور انسانی جذبات اسی حساب سے مرجھاتے اور دم توڑتے رہتے ہیں، اس تہذیب کے بڑے انقلابی اور ترقی پسند بھی رسم وراہِ عام کی پابندی اور محدود دائروں کی حدبندی سے نہیں نکل سکتے اور ان کا انقلابی ذہن انقلاب میں تقلید پسند ہی رہتا ہے۔

یاد آیامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ — جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
چشم مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار — بادہ خواراں را نگاہ ساقی اش پیغمبر است
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل — عقل ناپروا متاعِ عشق را غارتگر است
در ہوایش گرمیٔ یک آہِ بے تابانہ نیست
رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست[1]

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد — زیر گردوں رسمِ لادینی نہاد
مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست — آدمیت را غمِ پنہاں ازوست
در نگاہش آدمی آب و گِل است — کاروانِ زندگی بے منزل است

یورپ میں علم و ہنر کی روشنی تو بہت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بحرِ ظلمات چشمۂ حیواں نہیں رکھتا اسکی مادہ پرستی کا یہ حال ہے کہ رعنائی تعمیر، رونق اور حسن میں گرجوں کی عمارات سے بنکوں کی تعمیرات بڑھی ہوئی ہیں، اس کی تجارت میں ایک کا نفع اور لاکھوں کی موت پوشیدہ ہے،

---

[1] پیام مشرق۔ ۲۴۸

اور یہ علم و حکمت، یہ سیاست و حکومت جس پر یورپ کو ناز ہے، خالی خولی مظاہر ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں، مغربی قائدین بنی آدم کا خون پیتے ہیں، اور اسٹیج پر آکر انسانی مساوات اور عدالت اجتماعی کی تعلیم دیتے ہیں، بیکاری، عریانی، مے نوشی اور افلاس یہی فرنگی مدنیت کی سرفہرست فتوحات اور کارنامے ہیں جو قوم فیضان سماوی سے محروم ہوتی ہے اسکے کمالات کی حد اور اس کا مبلغ علم برق و بخارات سے آگے نہیں ہوتا جس تہذیب میں مشینوں کی حکومت ہو صنعت و حرفت ہی کی بادشاہی ہو اور انہی کا سکہ چلتا ہو اس میں دلوں کی موت، احساس مروت اور انسانی شرف و عزت کی ہلاکت یقینی ہے۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم حد اسکے کمالات کی ہے برق و بخارات

مغرب پر تنقید و تجزیہ کے لئے ان کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں بہت سی تصریحات ملتی ہیں، وہ مغرب کی مادی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ مشکلات و مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے انکے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے

متصادم ہے۔سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے دست و گریباں ہیں)
اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر
قابو حاصل کر سکے، یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لئے اسکی
جد و جہد تدریجاً ختم ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے
اکتا چکا ہے اس کی نظر حقائق پر ہے، یعنی جو اس کے اس سرچشمے پر جو اس کی
آنکھوں کے سامنے ہے، لہذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا
ہے، اور پھر جیسا کہ پہلے کو کبھی خدشہ تھا اور جسکا بتاسف وہ اظہار بھی کر چکا
ہے، مادیات کی اس باقاعدہ نشو و نما نے اس کے رگ و پے بھی مفلوج کر دئے
ہیں کچھ ایسی ہی حقیقت مشرق کی ہے۔

عصر حاضر کی لادینی اشتراکیت کا مطمح نظر جیسا کہ نسبتہً زیادہ وسیع ہے اور
اس کے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا لیکن اسکی اساس
چونکہ ہیگل کے مخالف نظر تبیین پر ہے لہذا وہ اس چیز ہی سے برسر پیکار ہے،
جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی، بہر حال یہ وطنیت ہو
یا لادینی اشتراکیت دونوں مجبور ہیں، کہ بحالت موجودہ انسانی روابط کی دنیا میں
تطابق و توافق کی جو صورت ہے، اس کے پیش نظر ہر کسی کو نفرت، بدگمانی اور
غم و غصے پر اکسائیں، حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا
ہے، اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے
تک پہنچ سکے جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی
وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس میں باہم دگر مقابلے اور مسابقت

نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے، نہ اس تہذیب و تمدن پر جسکی
روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے
پارہ پارہ ہو چکی ہے۔[1]

اقبال مغربی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں حرکت اور ترقی بغیر طبقاتی کشمکش اور وحشیانہ مقابلے کے ممکن نہیں، دینی اور سیاسی قدروں کی تفریق اور دین و دنیا کی علیحدگی کے تصور نے اس کی وحدت ختم کر دی ہے، وہ ہر صاحب نظر کی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو مادیت ہی کی دو شکلیں سمجھتے ہیں، جس میں ایک مشرقی اور دوسری مغربی ہوتے ہوئے بھی مادیت اور محدود انسانیت کے نقطے پر مل جاتی ہیں، وہ جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی کی زبان سے کہتے ہیں کہ مغرب روحانی قدروں اور غیبی حقائق کو کھو کر روح کو معدے میں تلاش کر رہا ہے، حالانکہ روح کی قوت و حیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اشتراکیت کی نظر بطن و معدہ سے آگے جاتی ہی نہیں اور وہ حد سے حد مساواتِ شکم ہی تک سوچتی ہے" ـــــ اخوتِ انسانی کی تعمیر مادی و معاشی مساوات پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے قلبی محبت، انسانی اقدار اور معنوی و روحانی بنیادوں کی بھی ضرورت ہے۔

غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نہ گیرد جانِ پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است — بیخ او در دل نہ در آب و گل است[2]

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۲۹۰ـــ۹۳ [2] جاوید نامہ ـ ۶۹

اسی طرح ملوکیت اور اشتراکیت، مادی نقطۂ نظر، حرص و ہوس، اضطراب و انتشار، خدا بے زاری، اور انسان کا استحصال کرنے کے نقطے پر آ کر مل جاتی ہیں، زندگی اگر اشتراکیت میں "خروج" ہے تو ملوکیت میں "خراج" محروم انسان ان دو چکیوں کے درمیان بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں پستا اور کچلتا جا رہا ہے، اشتراکیت اگر علم و فن اور دین و اخلاق کی دشمن ہے تو ملوکیت عوام الناس کے خون کی پیاسی ہے، اور امیر غریب دونوں کا خون چوستی ہے، دونوں سرتاپا مادی لذتوں میں غرق ہیں، ان کا جسم بہت تازہ اور روشن ہے لیکن ان کا قلب ظالم فاجر اور تاریک ہے۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب　　ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را "خروج" آں را "خراج"　　درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست　　آں برد جاں را زتن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل　　ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن　　در گلے تخم دلے انداختن[1]

مغربی تہذیب اور مسلم ممالک

اقبال کا پختہ عقیدہ ہے کہ مغربی تہذیب ممالک اسلامیہ کو ہرگز نجات نہیں دلا سکتی، نہ انکے مسائل کو حل کر سکتی ہے، نہ ان میں نئی زندگی کی کوئی روح پھونک سکتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو تہذیب اپنی موت آپ مر رہی ہے، وہ دوسروں کو زندگی کب دے سکتی ہے"، ع

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

---

[1] جاوید نامہ ۔۔ ۷۰

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو — آنکھ جنکی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر — یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور[1]

مغرب نے ہمیشہ مشرقی ممالک کے احسان کا بدلہ احسان فراموشی اور کافر نعمتی سے، اور بھلائی کی جزا برائی سے دی ہے، شام نے مغرب کو حضرت علیسیٰؑ کی شخصیت دی جن کا پیام عفت و عصمت اور غمخواری و رحمت، برائی کے بدلے بھلائی، ظلم کے مقابلے پر عفو تھا، لیکن مغرب نے شام پر اپنے قبضہ کے دوران خمر و قمار، بے پردگی اور آوارگی کے سوا کوئی تحفہ نہیں دیا:-

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا — نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے — مے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری!

مشرق میں تجدد کے علمبرداروں پر ان کی تنقید

وہ اسلامی ممالک میں تحریک تجدید (لیکن زیادہ صحیح الفاظ میں "مغربیت") کے علمبرداروں سے بدگمان نظر آتے ہیں اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ تجدید کی دعوت کہیں تقلید فرنگ کا بہانہ اور پردہ نہ ہو، کہتے ہیں:-

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

وہ اس تحریک اصلاح و تجدید (مغربیت) کے علمبرداروں کی بے بضاعتی اور تہی ماگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

---

[1] ضرب کلیم - ۶۸

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے | کہ بزم خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں | پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

وہ دوسری تہذیب و افکار کی اندھی تقلید کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ہر قوم کے لئے عار کی بات ہے اور اس قوم کے لئے ناقابل معافی گناہ ہے جو قوموں کی قیادت اور عالمی انقلاب کے لئے پیدا کی گئی ہے کہتے ہیں۔۔

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد | ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو | کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک | ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید | مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

وہ مشرق کی اسلامی اقوام کو ملامت کرتے ہیں جن کا منصب قیادت و امامت کا تھا لیکن وہ پست درجہ کی شاگردی اور ذلیل قسم کی نقالی کا کردار ادا کر رہی ہیں، غالباً ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے ترکی میں کمالی اصلاح و انقلاب کی سطحیت، اس کے کھوکھلے پن اور اس کے داعی و زعیم (کمال اتاترک) کی فکری کمتری اور یورپ کی بے روح نقالی کی مذمت کھلے طریقہ پر کی ہے ۔

مصطفےٰ کو از تجدد می سرود | گفت نقش کہنہ را باید زدود!
نو نگردد کعبہ را رخت حیات | گر ز افرنگ آیدش لات و منات

حرک راآہنگ نو درچنگ نیست　　تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ اورا دمے دیگر نبود　　در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم باعالم موجود ساخت　　مثل موم از سوزِ عالم درگداخت

مغربی تعلیم اوراس کے اثرات

مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اوراسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (GENOCIDE) کے مرادف تھا، عقلاء مغرب نےایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اوربدنام طریقہ کو چھوڑکراس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اوراس کام کے لئے جا بجا مراکز قائم کئے جنکو تعلیم گاہوں اورکالجوں کے نام سے موسوم کیا اکبر نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے اداکیا ہے ان کا مشہور شعر ہے:۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انھوں نے مشرقی اورمغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:۔

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس سے کئی برس بعد اقبال نے (جنھوں نے اس نظام تعلیم کا خود زخم کھایا تھا)

اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا۔

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ ازوے روح قومے می تواں کشت

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے، اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو　　ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

وہ مغرب کے اس نظام تعلیم کو دین و مروت و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں، جو مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل تک پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت، اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور فلسفہ کا مطلق اثر نہیں قبول کیا اور ان کا دینی فہم کتاب و سنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے[1]، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس آتش نمرود نے

---

[1] اس کا اندازہ ان کے ان خطبات سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے جس میں کہیں کہیں حقائق غیبی کی فلسفیانہ تعبیر اور تاویل کا شدید رنگ صاف جھلکتا ہے۔

ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک انکو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ:۔

طلسم علم حاضر را شکستم، ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیمؑ بنار او چہ بے پروا نشستم[1]



---

[1] مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ۔

اقبال اور عصری نظام تعلیم[1]

مغربی نظام تعلیم کی تنقید

اقبال نے جب اپنی بصیرت سے جدید نظام کا جائزہ لیا تو انھیں چند بہت بڑی کمزوریاں اور خامیاں نظر آئیں جنھیں انھوں نے اپنی تنقید اور صاف گوئی کا نشانہ بنایا اور ماہرینِ تعلیم کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی، وہ جہاں مدرسہ اور طالب علم کے جرم کا ذکر کرتے ہیں، وہاں اس سے مراد مغربی مدارس اور اس کے طلبہ ہی ہوتے ہیں، ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کے حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے، وہ مدرسہ و خانقاہ دونوں سے بیزار نظر آتے ہیں جہاں نہ زندگی کی چہل پہل ہے نہ محبت کا جوش و خروش، نہ حکمت و بصیرت ہے نہ فکر و نظر۔

---

[1] یہ مقالہ قاہرہ یونیورسٹی (سابق جامعۃ فواد الاول) میں ۵ رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو پڑھا گیا۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ!

وہ دانشکدوں کی کوزنگاہی و بے ذوقی اور خانقاہوں کی کم طلبی و بے توفیقی دونوں سے نالاں اور دونوں سے گریزاں ہیں۔

جلوتیانِ مدرسہ کوزنگاہ مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو!

عصری دانشگاہوں کا ظلم عظیم

اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے اعتناء اور قلب و روح کی نشوونما، روحانی ارتقاء، اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت کرکے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا ہے جس کے سبب اس کے قویٰ غیر متوازن، اور اس کی اٹھان غیر متناسب ہوئی ہے اور اس کی زندگی ہم آہنگی کے بجائے بے اعتدالیوں کا نمونہ بن گئی ہے، نئی نسل کے ظاہر و باطن، عقل و روح، علم و عقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے۔

اسکی عقل باریک مگر روح تاریک ہے اور اسکے ذہنی ارتقا کے ساتھ اس کا روحانی زوال بھی اسی حساب سے ہو رہا ہے، وہ نئی نسل کو بہت قریب سے جانتے تھے اس لئے جب بھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے یا کوئی بات کہتے ہیں تو وہ واقعہ کی تصویر ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کا پیمانہ، خالی، اس کی روح پیاسی اور تاریک ہے، مگر اس کا چہرہ بہت تازہ و بارونق اور اس کا ظاہر بہت چاق و چوبند

اس کی عقل روشن مگر بصیرت اندھی ہے، بے یقینی اور یاس و قنوط ان کی زندگی کا حاصل اور محرومی ان کی قسمت ہے، یہ نوجوان انسان نہیں انسانوں کی لاش ہیں، وہ اپنی ذات کے منکر ہیں، مگر دوسروں پر ایمان لاتے ہیں، اغیار دا جانب ان کے اسلامی خمیر سے دیر و کلیسا کی تعمیر کر رہے ہیں، اور ان کی صلاحیتیں "صرف در میکدہ" ہو رہی ہیں، سخت کوشی اور جفاکشی کے بجائے نرمی اور تن آسانی، لذت طلبی اور عیش کوشی ان کا مسلک بنتی جا رہی ہے۔

ان کی پست ہمتی کا یہ حال ہے کہ امیدیں اور آرزوئیں پیدا ہی نہیں ہوتیں یا پیدا ہوتے ہی گھٹ کے مر جاتی ہیں، نئی دانشگاہوں نے ان کے دینی جذبات کو پوری طرح سلا دیا اور انکے وجود کو ہم نفسِ عدم بنا دیا ہے۔

اپنی ذات اور اپنی شخصیت سے ناواقفیت اور اپنی صلاحیتوں سے بے پروائی ان میں عام ہے مغربی تہذیب کے زیر اثر وہ اپنی روح کا سودا روٹی کے چند ٹکڑوں پر بھی کرتے اور ضمیر فروشی کر سکتے ہیں، ان کے معلم بھی ان کی قیمت اور حیثیتِ عرفی سے ناآشنا ہیں، اس لئے انھوں نے انکو شرف و عظمت کے راز سے آگاہ نہیں کیا، وہ مومن ہیں، لیکن موت کی لذت سے بے خبر، اور توحید کی طاقت سے ناواقف، وہ فرنگ سے تہذیب کے لات و منات کی درآمد کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے، فرزند حرم ہو کر بھی ان کا دل "طواف کوئے ملامت" اور "سجدۂ پائے صنم" سے متنفر نہیں، فرنگ نے انھیں بغیر حرب ضرب اور قتل و غارت کے بھی مار ڈالا ہے، ان کی عقلیں بے جھجک، ان کے دل پتھر، اور نگاہ بیباک ہے، ان کے قلوب بڑے سے بڑے حوادث کی چوٹ سے بھی نہیں پگھلتے ان کے علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل، سب کا مرکز مادہ ہے، ان کے دلوں میں

افکارِ تازہ کی کوئی نمود نہیں، ان کے خیالات میں کوئی بلندی نہیں، ان کی زندگی پر جمود و تعطل کی برف جمی ہوئی ہے:-

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ
شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ
مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے — خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟
مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پرسوز — نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتشناک!
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا — دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک
آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں، — ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں
نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ — شستہ رو تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید — چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر ز خود مومن بغیر — خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر

اقبال نئی نسل کے نوجوانوں سے کیا توقعات اور ان کے متعلق کیسے بلند خیالات رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اشعار سے ہو سکتا ہے:-

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ایک قطعہ میں کہتے ہیں:-

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے!

"خطاب بہ جوانانِ اسلام" اور دوسری نظموں میں ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، طلبا رعلی گڑھ کالج کے نام "عشق کے دردمند" نے اپنے پیغام میں صاف صاف کہا:۔

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

ان کی نظم "ایک نوجوان کے نام" میں ان کے احساسات بڑی وضاحت سے آ گئے ہیں۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں — کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے انکو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے — امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ جب مسلم نوجوانوں کو اسلام کے بجائے دوسرے فلسفوں سے متاثر اور مرعوب دیکھتے ہیں تو فطری طور پر انھیں صدمہ ہوتا ہے اپنی نظم "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" میں کہتے ہیں

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناری برگساں نہ ہوتا
انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دیں سِرِّ محمدؐ و براہیمؑ

دل در سخنِ محمدی بند   اے پورِ علیؓ ز بو علی چند!
چوں دیدۂ راہ بیں نداری   قاید قرشیؐ بہ از بخاری!

اقبال نئی نسل کی بے ہمتی اور اس کی اخلاقی پستی کا ذمہ دار موجودہ نظام تعلیم کو قرار دیتے ہیں، جس کے ہاں اخلاق پر کوئی زور نہیں اور نہ تربیت کا کچھ خیال ہے، وہ کہتے ہیں کہ آجکل کے نوجوانوں کے دل سوز دروں سے خالی اور ان کی نظریں غیر عفیف ہیں، تعلیم یافتہ نوجوان کی زبان بہت تیز ہے، لیکن اس کی آنکھوں میں اشک ندامت اور دل میں خوف و خشیت ذرا بھی نہیں ۔

جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

وہ ان سب باتوں کے لئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو مورد الزام قرار دیتے ہیں جنھوں نے نوجوانوں کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے، اور ان کی فطرت مسخ کر کے رکھدی ہے، وہ دوسرا ذمہ دار حد سے بڑھی ہوئی "عقلیت" کو بھی سمجھتے ہیں، جو اولو العزمیوں اور پرخطر راہوں سے روکتی، اور ہر قدم پر مصلحت سنجی اور عاقبت بینی کا بہانہ تراشتی رہتی ہے

اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی اور اسباب طلبی، اور عہدوں، ملازمتوں، اور اونچی کرسیوں کو تعلیم کا مقصد سمجھنا بھی ہے، وہ کہتے ہیں، کہ بے مقصد افراد کے لئے علم دوائے نافع نہیں سم قاتل و قاطع ہے اور ایسی رزق سے موت بہتر ہے ۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مغربی تعلیم پر معاد کے بجائے معاش کا تصور جس طرح چھایا رہتا ہے وہ اس کے لئے جان لیوا ہے، اس تعلیم کا یہ فیض ہے کہ مرغ چمن محروم نوا اور فطرت بے رنگ ہو کر رہ جاتی ہے، وہ روٹی بھی ہاتھ میں نہیں تھماتی اور دوسرے ہاتھ سے روح بھی قبض کر لیتی ہے

نوا از سینۂ مرغ چمن بُرد　　　ز خون لالہ آں سوز کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی　　　کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن برد

جدید تعلیم کے مجرمانہ کردار کا اقبال نے بے باکی سے پردہ چاک کیا اور اس کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے، حد سے زائد فکر معاش، ناروا مصلحت بینی اور عافیت گزینی، اور مصنوعی تہذیب، نقلی زندگی اس تعلیم کی نمایاں پیداوار ہیں، اقبال نے اس کی نشاندھی کی ہے:۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　　قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا　　　جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا　　　جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو　　　خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

(مدرسہ)

تعلیم جدید پر اقبالؒ کی کڑی نکتہ چینی!

نئی تعلیم پر اقبال کے غم و غصہ اور سخت گیری کی ایک بنیاد یہ ہے کہ یہ تعلیم بطالت و تعطل، جمود و خمود، آرام طلبی و لذت کوشی کی تعلیم دیتی ہے، اور زندگی کو بجر منجمد بنا دیتی ہے، وہ طالب علم کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے　　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اسی طرح یہ تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب اسکے افکار اور اس کے مستقبل کے لئے نوآبادیات (COLONY) کی زمین فراہم اور ہموار کرتی ہے، اور نوجوانوں کو افرنگ زدہ بناتی ہے اور بلند معیار زندگی کی ہوس پیدا کرکے نئے نئے مسائل (PROBLEMS) سامنے لاتی ہے:۔

مشرق کی روایات وخصوصیات کو ختم کرکے وہاں وہ مغربی معاشرہ برپا کردینا چاہتی ہے، جہاں بقول میکالے (شکل وصورت کے لحاظ سے مشرقی لیکن ذہن وطبیعت کے اعتبار سے مغربی انسان) پائے جانے لگیں۔

مغربی تعلیم پر اقبال کی تنقیدوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس طرح اس کی بنیاد کفر والحاد یا پھر ذہنی انتشار اور فکری انارکی پر ہے، اسی طرح وہ یہ تمام ذہنی بیماریاں نئے دماغوں میں اتار دیتی ہے، فکر وفلسفہ، آزادئ رائے، وحریتِ خیال اور آزادانہ غور وخوض (FREE THINKING) کے نام سے ذہنی بے ربطی اور پریشان خیالی کو جنم دیتی ہے، اقبال کے خیال میں غلط بینی سے کورچشمی اور عالمانہ بیدینی سے نادانی بہتر ہے:۔

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے   زبینائے غلط بینے نکوتر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکوکیش   زدانشمند بے دینے نکوتر

اقبال کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ ان ذہنی جمناسٹکوں سے کیا حاصل جو انسان کو خلاباز اور ہوا پرواز بنادیں لیکن اسکے جمے ہوئے قدم بھی اکھڑ جائیں اور وہ اپنا مقام بھی کھو بیٹھے:۔

ازاں فکر فلک پیما چہ حاصل   کہ گردِ ثابت وسیارہ گردد

مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد   بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

یہ نظامِ تعلیم انسان کو مشینوں، صنعتوں اور ترقیوں کے آگے بے قیمت و بے حیثیت بنا دیتا ہے، حالانکہ انسان ہی بحرِ وجود کا گوہرِ مقصود اور مزرعِ ہستی کا حاصل ہے، دنیا کو انسان کے تابع ہونا چاہیئے نہ کہ انسان کو دنیا اور متاعِ دنیا کے:۔

منہ از کف چراغِ آرزو را   بدست آور مقامِ ہائے و ہو را
مشو در چار سوئے ایں جہاں گم   بخود باز آو بشکن چار سو را
دو گیتی را بخود باید کشیدن   نباید از حضورِ خود رمیدن
بہ نورِ دوش بیں امروزِ خود را   ز دوش امروز را نتواں ربودن (ارمغانِ حجاز)

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو   تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق
تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی   وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق (ضربِ کلیم)

اقبال کی نظر میں فکرِ بشری، وحیِ الٰہی اور فیضانِ سماوی کے بغیر خام اور ناتمام رہتی ہے اس لئے فکری ناپختگی کے باوجود اسے شرع سے آزاد اور بے قید کر دینا پریشاں خیالی اور ژولیدہ نگاہی کو دعوت دینا ہے۔

آزادیٔ فکر کے عنوان سے انھوں نے ایک بڑا بصیرت افروز اور معنی خیز قطعہ کہا ہے:۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی   رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار   انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ! (ضربِ کلیم)

مشرق میں ناپختہ افکار و فلسفہ نے جو وبائی شکل اختیار کر لی ہے اور غیر ہضم شدہ خیالات نے جس طرح دنیا میں ذہنی بے اطمینانی (MENTAL DISCONTENT)

پیدا کر دی ہے وہ بھی کالج کا عطیہ ہے جو ہر نئی ذہنی اپج کو فلسفہ کا نام دیدیتا ہے۔

پر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

"عصر حاضر" کے عنوان سے اقبال نے ایک قطعہ میں شرق و مغرب کی بنیادی خرابیوں کو طشت از بام کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ مشینی دور کی تیز روی اور عجلت پسندی نے ہر شے کی پختگی ختم کر دی ہے، اور فلسفہ کو بے ربط بنا دیا ہے، دیار فرنگ میں عشق و محبت کو ان کا حقیقی مقام اسی لئے نہیں ملا کہ لادینیت نے اس کا کوئی مرکز باقی نہیں چھوڑا اور مشرق میں عقل کو صحیح مقام اس لئے نہیں ملا کہ افکار میں کوئی تسلسل نہ تھا۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈھنے جائے کوئی — اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق — عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام (ضرب کلیم)

نظام تعلیم پر اقبال کی تنقید کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں میں مغرب کی اندھی تقلید اور خالص پیروی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے، اور ان میں جدت و اجتہاد کا کوئی جذبہ نہیں بیدار کرتا، وہ کہتے ہیں کہ دنیا تو خود رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے لیکن یہ دانش گاہیں، اس سے بھی تنگ دائروں میں بند ہیں، ان میں جا کر عبقری دماغ بھی امامت عصر کے بجائے ابن الوقتی اور زمانہ سازی کرنے لگتے ہیں۔

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں — بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار — کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت — وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو (اساتذہ)

اقبال کہتے ہیں کہ نئی نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں بلکہ وہ یورپ کی پرچھائیں ہے، اور اس کی مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے۔ نئی نسل جسم و مادہ کا وہ ڈھانچہ ہے جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے، لیکن اس میں روح نہیں پھونکی ہے، اس کا وجود، وہ مرصع نیام ہے جس میں کوئی تیغ قاطع نہیں، اقبال بڑے مزے سے کہتے ہیں کہ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے، لیکن میری نظر میں خود اس نسل ہی کا بود و وجود ہم نفس عدم ہے۔

تراوجود سراپا تجلّیٔ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود — مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود — کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

(افرنگ زدہ: ضرب کلیم)

اقبال کی رائے ہے کہ مغربی نظام تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچلنے کی پوری کوشش کی ہے، اور انھیں مردانِ کار کے بجائے مردِ بیمار بنا دیا اور بانکا، سجیلا، صباحت پسند بنکر رہنا سکھا دیا ہے، ان میں نزاکت و ملاحت، نرمی اور تخنث، اور نسائیت پیدا کر کے جہد و جہاد کی سرگرمیوں سے بہت دور کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں، کہ میری نظر میں اس علم کی کوئی قیمت نہیں جو مجاہد سے اس کے مردانہ اوصاف چھین لے اور مصافِ زندگی میں اسے سامانِ آرائش دے کر اس کے ہتھیار لے لے۔

اقبال بڑی دردمندی اور جاں سوزی کے ساتھ پُرخلوص انداز میں نئی نسل کے مربی سے درخواست کرتے ہیں، وہ جب ایک شفیق استاذ اور مہربان و غمخوار مربی کی زبان سے یہ کہتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں اور پوری ملت کا غم ان کے وجود میں

سمٹ آیا ہے :—

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا!
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے انکو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو انکو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ انکی پریشاں نظری کا
کہہ جاتا ہوں میں زورِ جنوں میں ترے اسرار — مجھکو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

(اے پیرِ حرم، ضربِ کلیم)



اقبال کا نظریۂ علم وفن

اقبال علم وفن، شعروادب اور زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں ایک خاص رائے رکھتے تھے، جو ان کے خیالات وتجربات کی بنیادوں پر قائم ہوتی تھی۔ ان کی ایک رائے یہ بھی کہ شعروادب کا ملکہ اور ذوقِ سلیم خدا کا عظیم عطیہ اور ناقابلِ تسخیر ہتھیار ہے، جس سے افکار ومعاشرت میں انقلاب لایا جا سکتا ہے، اور فاسد ماحول کے خلاف دلوں میں غضب وانتقام اور طبیعتوں میں اضطراب پیدا کیا جا سکتا ہے اور پھر غلط نظریات کی جڑ کاٹ کر صالح اور صحت مند اقدار کی آبیاری کی جا سکتی ہے، اس لئے شاعروادیب کے قلم میں وہ تاثیر اور قوتِ تسخیر ہونی چاہئے جو عصائے موسیٰ، یدِ بیضا اور دمِ عیسیٰ میں تھی، اسے دلبری اور قاہری کے ساتھ عالمِ انسانیت میں پیغامبری کا رول بھی ادا کرنا چاہئے۔

اقبال کا خیال ہے کہ جو ادب سرمایہ داروں کی فرمائش، کسی لالچ، کسی سطحی جذبہ کی تسکین یا دل کی تسلی اور محض ذوقِ جمال کی تشفی اور خوشامد کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ

رائگاں اور مظلوم ادب ہے جسے نہ خاطر خواہ مقام ملا نہ اس سے صحیح کام لیا گیا، وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں کہ میں احساسِ جمال اور حسن کی کیفیات کا منکر نہیں اس لئے کہ یہ تو فطری جذبہ ہے، لیکن معاشرے کے لئے اس مفلوج اور اپاہج علم کا کیا فائدہ جو عصائے موسیٰ کی طرح حجر و شجر کو بھی متاثر نہ کر سکے، وہ کہتے ہیں کہ شعر کو سحر اور سحر کو اعجاز تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ دلِ زندہ کی قوت و حیات اس میں مضطرب ہو اور اس کی رگوں میں زندگی اور تازگی کا گرم گرم خون دوڑ رہا ہو، وہ بڑے درد اور روحانی کرب کے ساتھ اہلِ نظر اور فن کاروں سے کہتے ہیں کہ اس ذوقِ نظر سے کیا حاصل جو نظارہ ہی میں الجھ کر رہ جائے اور حقیقت کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔

شاعر کی اس آتش نوائی اور مغنّی کی ناہید نفسی کا کیا فائدہ جو اپنے ماحول کو نہ گرما سکے اور نہ کسی دل تک راہ پا سکے، نسیمِ صبح اور بادِ صبا اگر چمن کے لئے پیامِ بہار نہ لائیں تو ان کی مسیحا نفسی کس کام کی؟

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا (فنونِ لطیفہ)

اقبال تو اس بلندی سے سوچتے ہیں، لیکن اپنے ہم چشم معاصرین کی جب پستی دیکھتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ مشرق کے ساتھ عالمِ اسلام کے ذہنوں پر بھی عورت کا راج ہے اور وہاں کا شاعر و ادیب بھی اسی کی بات کرتا اور اسی کا کلمہ پڑھتا ہے، مغنّی اسی کے گیت گاتا

اور مصور اسی کی نقش آرائی اور صورت گری کرتا رہتا ہے اور فن کاروں کو ہر جگہ اس کے حسن کی ضو اور جمال کا پرتو کابوس کی طرح گھیرے رہتا ہے اس طرح وحدۃ الوجود کی جگہ یہ نیا ادبی وحدۃ الشہود ظہور میں آیا ہے جہاں عالم کی انتہا اور ابتدا عورت ہی تک پہنچتی ہے اس سطحی لذت پسندی اور ہوس مشربی کی طرف اقبال نے کھلے لفظوں میں اشارہ کیا کہ

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبال اور علوم و فلسفہ

اقبال حکمت و فلسفہ اور دوسرے علوم نظری میں بھی اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ کوئی بھی نظریہ اور فلسفہ جب تک اپنی پشت پر جہد و جہاد کی قوت اور ایثار و قربانی کی ہمت نہیں رکھتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا فلسفہ ہو یا کوئی علم ہو اگر محض علمی بحث و نظر، لفظی بازی گری اور مابعد الطبعی مناقشہ آرائی تک محدود ہے، اور زندگی کے میدان میں نہیں اترتا اور انسانی معاشرے کے مسائل سے صرف نظر کرتا اور اپنی الگ دنیا میں رہنا چاہتا ہے، تو ایسے علم و فلسفہ کے لئے زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی، ایسا نظریہ و فلسفہ ایک نہ ایک دن اپنی موت آپ مر جائے گا۔

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

فلسفہ کے عمیق مطالعہ اور اس کی طویل تحقیقات و تجربات نے انھیں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیا کہ فلسفہ زندگی کے مسائل کے حل میں سراسر ناکام، اس کا آبدار صدف گوہر زندگی سے خالی اور وہ عملی دنیا سے بڑی حد تک کنارہ کش ہے۔

وہ انسانیت کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور نہ زندگی کو کوئی راہ عمل دے سکتا ہے، زندگی کے مکمل دستور و نظام کے لئے وہ رسالتِ محمدی کا نام لیتے ہیں، وہ اپنے ایک فلسفہ زدہ دوست کو ہمدردانہ عتاب و نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو اصل کا سومناتی ہوں اور میرے آباء واجداد لاتی و مناتی تھے، میرا خاندان برہمن تھا، لیکن اس کے باوجود میں آغوشِ کفر سے نکل کر دامنِ اسلام میں پہنچا، لیکن تیری رگوں میں تو ہاشمی خون جاری ہے اور تجھے سید الاولین والآخرینؐ سے قرابت و فرزندی کا فخر حاصل ہے لیکن تم انھیں چھوڑ کر فلسفیوں کے وہم و گماں کے شکار ہو رہے ہو ـــــــ حالانکہ میں کہ میرے وجود میں فلسفہ گوشت پوست کی حیثیت رکھتا ہے، اور میں اس میں اترا ہوا ہوں یہی سمجھتا ہوں کہ فلسفہ حقیقت کا حجاب ہے اور وہ انسان کو زندگی سے دور کر کے رہتا ہے، اس کے مباحث روحِ عمل کو مضمحل بنانے میں افیون سے زیادہ تیز ہیں، ہیگل بے چارہ بھی دوسروں کی طرح خالی خولی اور اسیر وہم و گماں ہے ـــــــ تمہاری زندگی میں شعلۂ دل کی آگ بجھ گئی ہے اور تو نے اپنی شخصیت کھو دی ہے اس لئے برگساں کے مقلد بن رہے ہو بنی آدم زندگی کا پیغام چاہتے ہیں، لیکن فلسفہ خاموش ہے، مومن کی اذاں وہ پیام بیداری ہے جس سے دنیا روشن اور کائنات بیدار ہو جاتی ہے، وہی دین و مذہب زندگی کی تنظیم کر سکتے ہیں، جو ابراہیمؑ و محمدؐ کا عطیہ ہیں، اے ابن علی! بوعلی سینا کی تقلید کب تک؟ تمہارا قریشی قائد بخاری (ابن سینا) سے کہیں زیادہ قابلِ تقلید ہے۔

دل در سخن محمدی بند   اے پورِ علی ز بو علی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری   قائد قرشی بہ از بخاری!

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے خیال میں موجودہ نظام تعلیم اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا ہے، اور وہ ایسی نسل کو تربیت نہیں دے سکا ہے کہ جو اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاتی اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھتی، بلکہ اس کے برعکس وہ افریقہ اور قطب شمالی کی نامعلوم سرزمین سے واقف اور حیوانات و نباتات سے آگاہ ہے لیکن انسانیت کی پہچان اور خودی کے عرفان سے قطعاً غافل! برق و بخارات، ایٹمی اور جوہری توانائی اور نیوکلیائی طاقت کا پتہ اس نے لگایا لیکن اپنی طاقت کا اندازہ اسے نہیں ہوا ہے، دنیا کو مسخر کرلیا، لیکن اپنے اوپر قابو نہیں پاسکا وہ ہوا میں اڑتا اور پانی پر تیرتا ہے، لیکن زمین پر انسان کی طرح چل نہیں سکتا۔

یہ سارا قصور نظام تعلیم کا ہے، جس نے اس کا توازن غلط اور مزاج فاسد کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ شعاعِ شمسی کو گرفتار کرنے والا اپنا مقدر نہ چمکا سکا، نظام سیارگان کو جاننے والا کسی راہِ عمل پر نہیں پہنچ سکا اور سائنس کا محقق اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکا:۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا   زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا   اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا   آجتک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

اخیر میں اقبال اس مسلم نوجوان کی تمنا کرتے ہیں جس کی جوانی بیداغ اور جس کی ضرب کاری ہو، جو جنگ میں شیر و پلنگ اور صلح میں حریر و پرنیاں ہو، جو رزم و بزم دونوں کا حق ادا کرے جو

"نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو" کی مثال اور صلح و جنگ میں مثالی شخصیت کا مالک ہو جس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں، جو فقر میں غنی اور امیری میں فقیر ہو، بوقت تنگدستی خوددار وغیور اور بوقت فراغ کریم و حلیم ہو جو عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہو، جو حلقۂ یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح تند و گرم ہو، کبھی وہ شبنم ہو جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پہنچتی ہے اور کبھی وہ طوفان جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں اگر اس کی راہ میں کہستان و سنگستان آئیں تو سیل تند رو اور اگر محبت کا شبستان سامنے ہو تو "جوئے نغمہ خواں" بن جائے، جو صدیق کا ایمانی جلال، علی مرتضیٰ کی قوت و فتوت، ابوذر کا فقر و استغنا اور سلمان کا صدق و صفا رکھتا ہو، جس کا یقین، بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہو، جو مومنانہ حکمت و فراست کا آئینہ دار اور ہمت مردانہ کا علمبردار ہو جو شہادت کو اپنا کر حکومتوں کو ٹھکرا سکتا ہو جو ستاروں پر کمند ڈال سکتا اور نوامیس فطرت کو نخچیر بنا سکتا ہو، جو اپنی رفعت و عظمت میں فرشتوں کے لئے بھی باعث رشک ہو جس کا وجود دنیا میں کفر و باطل کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہو جس کی قیمت پوری کائنات بھی نہ بن سکے اور جسے اس کے خالق و مالک کے سوا کوئی نہ خرید سکے جس کے مقاصد جلیلہ سے زندگی کی سطحیت اور زیب و زینت سے بلند تر کر چکے ہوں، جو چنگ و رنگ اور نغمۂ آہنگ کے فریب سے نکل چکا ہو اور تہذیب جدید کے بلبل و طاؤس کی تقلید سے یہ کہہ کر انکار کر چکا ہو کہ۔ ع

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ!



اقبال اور فنون لطیفہ[1]

فنونِ لطیفہ کی حیثیت اقبال کی نگاہ میں کسی سنجیدہ اور مفید علم سے کم نہیں، وہ فن کاروں کو نسل انسانی کا معلم اور پیغمبرانہ انقلاب کا نقیب سمجھتے ہیں وہ فائن آرٹ کو تفریح و تسلّی اور سستی افادیت کے لئے استعمال کرنے کے خلاف ہیں، اس کے برعکس انسانی خودی اور اس کی شخصیت کی تعمیر کا کام اس سے لینا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مظاہر و مناظر میں پھنس کر رہ جانے کے بجائے فنونِ لطیفہ کو دلوں تک اپنی رہ گزر بنانا چاہیئے اور اسے ترسی دردل بینی اور حقیقت پسندی پر مبنی ہونا چاہیئے دین و ادب، حکمت و ہنر دونوں کو انسان کی خفتہ صلاحیتوں اور نہفتہ امکانات کو ابھارنے، نکھارنے اور سنوارنے کا فریضہ انجام دینا چاہیئے، زوال پذیر دین و ادب کی علامت ان کی نگاہ میں یہ ہے کہ وہ انسانیت اور زندگی کے حقیقی مسائل سے صرف نظر کر لیتے ہیں ۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

---

[1] اضافہ از مترجم

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات ‌‌‌ نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی ‌‌‌ خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ (دین و ہنر)

اسلام کے زیرِ اثر اقبال نے فنونِ لطیفہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کا صحیح مقام و پیام متعین کیا۔ وہ فن کار کی تخلیق کے دل سے قائل اور قدرداں ہیں لیکن فنونِ لطیفہ میں وہ شعر و ادب اور فلسفہ کو اولیں مقام دیتے ہیں نغمہ و آہنگ اور خشت و سنگ کو ان کے ہاں ثانوی درجہ حاصل ہے، اس لئے کہ وہ ان سب کی بنیاد فکر و خیال ہی کو قرار دیتے ہیں:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود ‌‌‌ کہ خشت و سنگ سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے ‌‌‌ اس آبِ جو سے کئے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے ‌‌‌ جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا (تخلیق)

اقبال جس طرح اپنی الگ اور خاص اصطلاحات رکھتے ہیں، یعنی علم و عشق، عقل و دل، فقر و خودی، قلندری و شاہینی وغیرہ اسی طرح ان کا جنون بھی باہوش ہے، وہ جنوں کو خلوصِ عشق، دل کی لگن، اور ایک جذبۂ سرشاری سمجھتے ہیں جس سے مافوق الفطرت اور خارق عادت کرامات اور معجزات صادر ہوتے ہیں، جنوں ان کے ہاں جسم و روح کی کسی کام کے لئے متفقہ یکسوئی کا نام ہے، اسی لئے وہ اپنی نظم مدنیتِ اسلام میں کہتے ہیں:۔

بتاؤں تجکو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں!

زندگی کی طرح وہ فنونِ لطیفہ میں بھی جنوں کی کارفرمائی اور فن کار کا انتہائی خلوص اور ریاض پسند کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عشق و جنوں کو صحرا کی فضا نہیں آبادی کی ہوا بھی راس آتی ہے:۔

کسے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں　　کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ
ہجوم مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو　　کہ اسکے واسطے لازم نہیں ہے ویرانہ (جنوں)

وہ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں۔

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے　　جس نے سئے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں　　مستی ہے جس کی بے منت تاک

اقبال نے ایک مضمون میں اپنے ادبی اور فنی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فن کار کا پہلا فرض ہے کہ اپنی خودی، اپنے اندرون، اور اپنے حقیقی یا روحانی وجود کا اثبات کرے اس لئے کہ اظہارِ "انا" اور اثباتِ وجود ہی سے "بقائے دوام" بھی ملتی ہے، اس کے ساتھ ہی اقبال نے لکھا ہے، فن کار کو اپنی ذات سے چل کر کائنات تک پہنچنا چاہیئے اور کثرت میں وحدت، جلوت میں خلوت اور اجتماعی بیخودی میں انفرادی خودی کا دامن ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے، اس لئے کہ یہ مادی کائنات مٹی کی طرح ہر شے کو جذب اور ہضم کر لینا چاہتی ہے، چنانچہ ادب و فن کے وہی شاہکار دوامی اور حقیقی کہے جا سکتے ہیں جن میں مادیت سے روحانیت کی طرف گریز اور مادیت پر فتحمندی ملتی ہو، اقبال نے مزید لکھا ہے کہ فن کار کو حسن کے امکانات کا سراغ اپنے ہی اندر لگانا چاہیئے نہ کہ خارجی اور ظاہری جمالیات کو اپنا مطمح نظر بنانا چاہیئے، انھوں نے اس موقع پر ایک معنی خیز شعر لکھا ہے۔

حسن را از خود بروں جستن خطا است
آنچہ می بایست پیشِ ما کجا ست؟

یعنی فن کا کام "کیا ہے" پر قناعت نہیں بلکہ "کیا ہونا چاہیئے" کی جستجو اور آرزو پیدا کر دینا ہے۔

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں — کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود!
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی — نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبود (امید)

وجود کے بلند آہنگ اظہار و اعلان کے لئے اقبال خلوصِ عشق، سوزِ خودی، جذبۂ زندگی اور عرفانِ نفس کو ضروری قرار دیتے ہیں:۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود — کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
مکتب و مدرسہ جز درسِ نبودن ندہند — بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود (وجود)

اثباتِ وجود و خودی سے پہلے فن کار کو اپنی پہچان ضروری ہے، پھر تعمیرِ خودی کیلئے نیاز میں ناز پیدا کرنا اور قطرہ کا روکشِ دریا ہونا لازم ہے۔ اقبال کی لطافتِ حس دیکھئے کہ وہ نماز میں سجدے کو بیخودی اور قیام کو خودی کا اظہار سمجھتے ہیں اور عبادت کی محویت میں بھی عبدیت کی انفرادیت اور اس کا تیکھا پن برقرار رکھنا چاہتے ہیں:۔

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز ابتک — ترا وجود ترے واسطے ہے راز ابتک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز ابتک — کہ ہے قیام سے خالی تری نماز ابتک
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز ابتک — کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک (رومی)

اقبال ہر اس فن و ہنر کے مخالف ہیں جو زندگی سے دور لیجاتا ہے اور انفرادیت کو کچلتا ہے اور جس میں انسان تابعِ محض اور کائنات گوہرِ مقصود ہوتی ہے۔ وہ موجودہ تمثیل، تھیٹر اور ڈرامہ کے اسی لئے خلاف ہیں کہ وہ مصنوعی پن، نقالی، اور بہروپ کے سوا کچھ نہیں جس میں انسان "تماشا" اور کائنات تماش بین بن جاتی ہے:۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود — حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات!

بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام | اسی کے نور سے پیدا ہیں تیری ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ! | دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے | رہا نہ تو تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات (تیاتر)

وہ مصوری (PAINTING) میں انسانی شخصیت کی نمود اور تعمیر انسانیت کے کسی پیام کا وجود ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لئے مشرقی مصوری کی روحانیت کے قائل اور مغرب کی تجریدی مصوری (ABSTRACT ART) سے نفور ہیں۔ مصوری میں انسان شائستہ اور ارفع جذبات و احساسات کی نقش آرائی اور صورت گری انھیں پسند ہے اور سطحی اور وقتی خیالات کے وہ قائل نہیں۔ مشرقی مصوری کا ازلی سوز و سرور اور اس کی روحانیت انھیں دل سے پسند ہے ۔

مجکو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد | کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرور ازلی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے | آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی (مصور)

رود و سرود اصوت و آہنگ اور نغمہ و زمزمہ میں بھی انھیں وہ آتش نوائی اور شعلہ نفسی پسند ہے جس میں دل کی آنچ ہو اور رگِ ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں ہو اور مغنی صرف لہجے کے اتار چڑھاؤ اور تال سُر اور نغمہ کے زیر و بم کا نمائندہ نہ ہو بلکہ صاحب دل بھی ہو ۔

آیا کہاں سے نالۂ نَے میں سرورِ مے | اصل اسکی نَے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نَے
دل کیا ہے اسکی مستی و قوت کہاں سے ہے | کیوں اسکی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کے
کیوں اسکی زندگی سے ہے اقوام میں حیات | کیوں اسکے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں | جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رَے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا | سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے (سرود)

اقبال اس نغمۂ جاوداں، لافانی آہنگ اور اس مغنی آتش نفس کو ڈھونڈتے ہیں جس کی صدا "جلوۂ برق فنا" کی جگہ "کرشمۂ دوام وبقا" ہو جس سے دل زندہ بیدار ہو جائے اور ستاروں کا وجود پگھل جائے جو انسانیت کے لئے مساوات کا پیامی ہو، اور جس سے پوری کائنات بیدار ہو جائے۔

مۂ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے ۔۔۔ تو رہے اور ترا زمزمۂ لاموجود
جسکو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی ۔۔۔ منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام ۔۔۔ حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہرآلود ۔۔۔ وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

اقبال مصوری اور موسیقی کو غلاموں کے فنونِ لطیفہ میں شمار کرتے ہیں جن سے فطرتِ انسانی طرح طرح کی تکلفات کی غلام بن جاتی ہے وہ کہتے ہیں کہ نغمۂ موسیقی زندگی کے بجائے موت کا پیغام دیتے ہیں، اور آدمی کو زار و ناتواں بناتے اور دنیا سے بیزار کر دیتے ہیں اس سے دل کا سوز و گداز ختم ہو کر ایک غم آگیں کیفیت سوہانِ روح بن جاتی ہے، اس سے وہ غم بھی نہیں ملتا جو دوسرے تمام غموں کو بھلا دیتا ہے، بلکہ اس کا غم یاس و قنوط کی پیداوار ہوتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں نغمہ کو وہ سیلِ تندرو ہونا چاہیے جو غموں کا خاتمہ کر دے جو جنوں پرور دہ اور خونِ دل میں حل کردہ ہو ان کے خیال میں نغمہ کی انتہا یہ ہے کہ وہ بے صوت و صدا ہو جائے۔

می شناسی در سرود است آں مقام
کاندرو بے حرف می روید کلام

وہ کہتے ہیں جو نغمہ و آہنگ معنی و پیام نہیں رکھتا وہ مردہ اور افسردہ ہے اور معنی مولانا روم کے الفاظ میں وہ ہیں جو آدمی کو اپیل کریں نہ کہ دوسرے خارجی نقش و نگار پر مائل کردیں:-

معنی آں باشد کہ بستاند ترا بے نیاز از نقش گرداند ترا
معنی آں نبود کہ کور و کر کند مرد را بر نقش عاشق تر کند!

اس کے بعد ان کا روئے سخن "مصوری" کی طرف ہوتا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ مصوری میں نہ ابراہیمی فطرت ہے نہ آذری صنعت، بلکہ اس میں سراسر اوٹ پٹانگ جزئیات کی تصویر کشی اور مجموعی حیثیت سے موت کی نقش گری ملتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ مصور خود کسی عقیدہ و پیام پر مطمئن نہیں، اس لئے اس میں نہ لذتِ تحقیق ہے نہ قوتِ تخلیق، اس کا اپنا کوئی ذوق نہیں بلکہ وہ عوامی ذوق کا اجیر اور کرائے کا مزدور ہے، وہ حسن کو مظاہرِ قدرت اور مناظرِ فطرت میں ڈھونڈتا ہے لیکن وہ تو ایک داخلی کیفیت ہے۔

جو فن کار انسان اور کائنات کو ایک سطح سے دیکھتا اور مٹی کی پیداوار سمجھتا ہے وہ اپنے ساتھ انصاف نہیں کرتا، فن کار اور اہل کمال میں کچھ وہ باتیں بھی ہوتی ہیں جو غیر معمولی اور معجزانہ کہی جا سکتی ہیں۔

خویش را آدم اگر خاکی شمرد نور یزداں در ضمیر او بمرد
چوں کلیمے شد برون از خویشتن دستِ او تاریک و چوب او رسن
زندگی بے قوتِ اعجاز نیست ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست!

اقبال کہتے ہیں کہ فن کار کو فطرت کی بازیافت ہی نہیں بلکہ اپنے اندر سے کے

مافوق الفطرت عناصر سے فطرت پر اضافہ بھی کرنا چاہیئے اور حیات وکائنات میں ایک دوسری حیات وکائنات کی طرح توڑ ڈالنا چاہیئے اور اپنی روح کے وفور اور فراوانی سے زندگی کے ہر خلا کو پر کردینا چاہیئے۔

زاں فراوانی کہ اندر جانِ اوست | ہر تہی را پُر نمودن شانِ اوست
فطرتِ پاکش عیارِ خوب و زشت | صنعتش آئینہ دارِ خوب و زشت (زبورِ عجم)

فن کار کے لئے تسخیر کائنات سے پہلے تسخیر ذات اور تعمیر خودی ضروری ہے، انہی بنیادوں پر فرد اپنی تکمیل کے بعد وجود کائنات کا اہم جز بن جاتا، اور رفتہ رفتہ کونین پر چھا جاتا ہے۔

منہ پا در بیابانِ طلب سُست | نخستین گیر آں عالم کہ در تست
اگر زیری، ز خود گیری زبر شو | خدا خواہی؟ بخود نزدیک تر شو
بہ تسخیرِ خود افتادی اگر طاق! | ترا آساں شود تسخیرِ آفاق (گلشن راز جدید)

موسیقی ومصوری کے مقابلے پر اقبال فن تعمیر (ARCHITECTURE) کے اس کے مناسب حدود میں قائل ہیں اور ان کا یہ خیال ذاتی نہیں اسلامی فکر کا عطیہ ہے فن تعمیر میں بھی وہ اس عمارت سازی کو مستحسن سمجھتے ہیں، جس کے پیچھے کوئی پیغام اور جس کی بنیادوں میں عشق کا استحکام ہو، وہ اندلس جا کر قصر الحمرا دیکھتے ہیں لیکن اس سے متاثر نہیں ہوتے، اس کے برعکس مسجد قرطبہ کو دیکھ کر ان کی روح پھڑک اٹھتی اور وجدان جھوم اٹھتا ہے، وہ خود لکھتے ہیں۔

"الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی"[1]

---

[1] اقبال نامہ ۲/۳۲۲

اسی طرح وہ پیرس کی عالیشان مسجد دیکھتے ہیں لیکن وہ ان کا دامنِ نظر نہیں کھینچتی اس لئے کہ اس کی اساس میں کوئی پرکشش بات نہیں ۔

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ!
حرم نہیں ہے فرنگی کرشمہ بازوں نے تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بتخانہ
یہ بتکدہ انہی غارتگروں کی ہے تعمیر دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ (پیرس کی مسجد)

لیکن سلطان قطب الدین ایبک کی بنائی ہوئی "مسجد قوت الاسلام" کا کھنڈران کو جان جی سے بھاتا ہے اور وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں، اس لئے کہ اس ویرانہ میں انھیں عزم واخلاص کا وہ تاریخی پس منظر یاد آجاتا ہے جب اسلام کا مسافر غربت کدۂ ہند میں رخت انداز ہوا تھا اس روحانی یاد سے ان کے دل کا ہر تار بج اٹھتا ہے اور وہ یوں حسرت سنج ہو جاتے ہیں:۔

ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی لا الٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود
چشمِ فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقامِ محمود
کیوں مسلماں نہ خجل ہو تری سنگینی سے کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود
ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود!
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز بے تب و تابِ دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود! (مسجد قوت الاسلام)

وہ قطب الدین ایبک شیر شاہ سوری اور شاہجہاں کی تعمیرات کو مردانِ آزاد کے فن تعمیر کا نام دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر تم میں دل وجگر کی تاب ہے تو ان کی یادگاروں کو دیکھو کہ کس طرح انھوں نے اپنی شخصیت کو ان عظیم عمارتوں میں ظاہر کیا ہے اور پتھروں کی

سلوں میں وقتِ گریز پا کو بند کر دیا ہے ان کی پختگی دیکھ کر آدمی میں پختگی پیدا ہوتی اور اس کی دنیا بدل جاتی ہے، ہمت مردانہ اور طبع بلند ان پتھروں کے سینے میں لعل ارجمند کی طرح چمک رہے ہیں، یہ پتھر کسکی سجدہ گاہ ہیں، یہ مجھ سے مت پوچھ روداد جاں اہل دل ہی بتا سکتے ہیں میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جس لوحِ جبیں میں نیروئے الا اللہ نہیں وہ شایان بارگاہ نہیں ۔

در من آں نیروئے الا اللہ نیست
سجدہ ام شایانِ ایں درگاہ نیست!

اس کے ساتھ وہ تاج محل کو خراج عقیدت دیتے ہوئے کہتے ہیں "تاج کو چاندنی میں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مرمر کی سلوں میں آب رواں سے زیادہ تیزی آگئی ہے اور ابد کا طول دور یہاں کے ایک ایک لمحہ کے برابر ہو گیا ہے یہاں عشق نے پتھروں کی زبانی اپنا راز کھولا اور انھیں نوکِ مژگان میں پرو دیا ہے یہاں سنگ و خشت سے جنت کے نغمے پھوٹ رہے ہیں اور عشق حدود و تعینات کی سرحدیں پھاند کر لازوال بن گیا ہے،

وہ کہتے ہیں کہ محبت ہی ہے، جو انسان کو پر لگا دیتی ہے، اور جذبات کو بلند و ارجمند کر دیتی ہے، عشق سے عقل کی صیقل ہوتی ہے، اور خشت و سنگ میں جو ہر آئینہ کی جھلک آجاتی ہے عشق سے اہل دل کو سینہ سینا اور اہل ہنر کو ید بیضا مل جاتا ہے۔

اقبال کے نظریۂ فن کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ جمال کو جلال ہی کا ایک رخ سمجھتے ہیں اور جمالِ بے جلال انھیں متاثر نہیں کرتا ۔

دلبری بے قاہری جادوگری است — دلبری با قاہری پیغمبری است (زبورِ عجم)
تا نہ گیری از جلالِ حق نصیب — ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

ابتدائے عشق و مستی قاہری است ــــ انتہائے عشق و مستی دلبری است (پس چہ باید کرد)

جبین بندۂ حق میں نمود ہے جس کی ــــ اسی جلال سے لبریز ہے ضمیر وجود (ضرب کلیم)

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے ــــ یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل!

اسی نگاہ میں ہے، قاہری و جباری ــــ اسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی

اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں انھوں نے ایک نظم "جلال و جمال" میں وضاحت کر دی ہے:

مرے لئے ہے فقط زور حیدری کافی ــــ ترے نصیب فلاطوں کی تیزی ادراک!

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی ــــ کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر ــــ ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ ــــ کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

غالباً یہ اقبال ہی کا کہا ہوا لطیفہ ہے کہ کسی یورپی جوڑے نے جب آبشار نیاگرا دیکھا تو عورت بولی "اف! کتنا حسین ہے"! جبکہ مرد نے کہا "ہاں! بہت پرشکوہ ہے"! اس سے اس صحت مند ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کیوں جلال و شکوہ کے قائل ہیں ــــ

ــــ جہاں تک فن کار کے فرائض کا تعلق ہے، اقبال کہتے ہیں کہ اس کا انداز نظر اور اس کی افتاد طبع (ATTITUDE) عام سطح سے بلند پاکیزہ اور معیاری ہونا چاہیئے اسے وہ نظر حاصل کرنا چاہیئے، جو شئے کی حقیقت دیکھ سکے اور بادہ میں نشہ کا اندازہ کر لے (در بادہ نشہ می نگرم آں نظر بدہ) ان کے خیال میں یہ نگاہ ہی ہے، جو فن کار کے نقطۂ نظر کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ٹھہرتی ہے اس لئے اسے ایسا ہونا چاہیئے کہ حسن حقیقی تک پہنچنے کے لئے کوئی حجاب اس کے لئے حجاب نہ رہے، اسے رجائی اور امید پرور ہونا چاہیئے تاکہ تخریب میں تعمیر، ویرانی میں آبادکاری اور بگاڑ میں بناؤ کی جھلک دیکھ سکے، ان کی رائے میں

فن کار کی نگاہ شوق فطرت کا صرف آئینہ ہی نہیں بلکہ اس کا معیار اور کسوٹی بھی ہے وہ صرف دیکھتا ہی نہیں پرکھتا بھی ہے، جانتا ہی نہیں جانچتا بھی ہے، اس طرح وہ فطرت کے حسن میں اپنے حسنِ نظر سے اضافہ کرتا ہے، اور اسے نئی معنویت عطا کرتا ہے، وہ اپنی نظم "نگاہِ شوق" میں کہتے ہیں:۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا — کہ ذرّہ ذرّہ میں ہے ذوقِ آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں — نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی!
اسی نگاہ سے محکوم قوم کے فرزند — ہوئے جہاں میں سزاوارِ کار فرمائی
اسی نگاہ سے ہر ذرّہ کو جنوں میرا — سکھا رہا ہے رہ و رسمِ دشت پیمائی
نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو — ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی (ضربِ کلیم)

فن کار کی انفرادیت اور مخصوص اندازِ نظر کے بارے میں کہتے ہیں:۔

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

ان کے خیال میں فن کار اپنی ذات سے انجمن اور آپ اپنی دنیا ہوتا ہے، یعنی خارجی دنیا کی تعمیرِ جدید سے پہلے عالمِ نو پہلے اس کی اندرونی دنیا میں کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور پھر وہ اس نقشے کے مطابق خیال کو عمل بنانا چاہتا ہے:۔

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر — خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے — کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کفِ خاک — روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر
فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو — صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے

اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اقبال فن کار کیلئے محنت و محویت، مقصد کا عشق اور نصب العین کے لئے خلوص اور لگن کے کس قدر قائل ہیں ریاض اور جانسوزی کی ضرورت ان کے ہاں ذوقِ سلیم کے باوجود باقی رہتی ہے، وہ "تلامیذ الرحمٰن" کی سہل انگاری کے قائل نہیں۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہرچہ بآئینہ نمایند بپرہیز

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

(ضربِ کلیم)



انسانِ کامل" اقبال کی نگاہ میں[1]

اقبال کی نگاہِ متجسس کو اس عالم رنگ و بو میں جو اپنے اندر گوناگوں دلفریبیاں اور دلچسپیاں رکھتا ہے، صرف درندوں کا بھٹ اور چوپایوں کا جنگل نظر آیا اور اس کی متجسسانہ نگاہیں اس درندوں اور چوپایوں کی دنیا میں کسی "انسان" کی جویا ہیں، اپنے اس تلاش و جستجو کی ابتدا اپنی مشہور کتاب "اسرار خودی" میں مولانا جلال الدین رومی کے ان اشعار سے کی ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت　　شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

---

[1] یہ وہ مقالہ ہے جو جامعہ فوائد الاول (حال قاہرہ یونیورسٹی) کے لئے لکھا گیا تھا، اور ۵ رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو پڑھا گیا اور بعد میں اس مقالہ کو دو علیحدہ عنوانوں کے ماتحت دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ "اقبال اور عصری نظام تعلیم" کے عنوان سے پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے۔

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما   گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اندھیری رات ہے اور ایک درویش سن رسیدہ ہاتھ میں مشعل لئے کوچہ و بازار کی خاک چھانتا پھرتا ہے جیسے اس کی نگاہ کسی گمشدہ کی تلاش میں ہو میں نے کہا حضرت سلامت کس چیز کی تلاش ہے؟ فرمانے لگے ان درندوں اور چوپایوں کی بستی میں رہتے رہتے طبیعت عاجز آگئی ہے، اب اس وسیع کائنات میں کسی "انسان" کی تلاش میں نکلا ہوں، ایک ایسا نوجوان جس کی مردانگی اور شخصیت میری روح کو تسکین اور بالیدگی عطا کر سکے میں نے کہا آپ کس دھوکے میں ہیں؟ یہ تو عنقا کی تلاش ہے، اس کے پیچھے اپنے آپ کو کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں؟ میں نے اس راہ میں در در کی خاک چھانی ہے دشت و صحرا، آبادی و ویرانہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں مگر اس کی حقیقت تو کیا پرچھائیں بھی نظر نہ آئی، درویش نے کہا مجھے تو اس شئے کی تلاش و جستجو زیادہ محبوب ہے جس کا وجود نادر اور جس کا حصول آسان نہ ہو ———— !

سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس "گمشدہ انسان" کو اس وسیع کائنات میں پالیا یا حیران و سرگرداں بھٹکتے پھرے؟ اقبال کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی طرف اچھی نشاندہی کرتا ہے، بیک نظر اور بلا خوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں اقبال نے اس کھوئے ہوئے انسان کو پالیا اور نہ صرف پایا بلکہ اس کو اچھی طرح پہچانا اور زندگی کے طویل ایام اس کے ساتھ گذارے، اقبال کا یہ انکشاف کولمبس کی نئی دنیا کے انکشاف سے زیادہ وسیع اور بڑا انکشاف ہے اور بلا شبہ ایک فتح عظیم ہے اس لئے کہ کھوئے ہوئے انسان کی تلاش و جستجو اور پھر اس میں کامیابی اس عالم کی سب سے بڑی خوش بختی اور سب سے بڑی یافت ہے، خصوصاً اس دور میں جب کہ "انسان" کھو چکا ہو اور انسانیت

افسانہ بن چکی ہو۔

اقبال کا وہ گمشدہ انسان جسے وہ "انسان کامل" سے تعبیر کرتا ہے کہاں ہے؟ اور کون ہے؟ مجھے یہ ڈر ہے کہ ہم میں سے اکثر اس سوال کا جواب سن کر چونک پڑیں گے جب کہ ان کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ اقبال کا "انسان کامل" ایک "سچا مسلم" ہے اور ان کا یہ چونکنا بڑی حد تک بجا ہے، کیونکہ وہ لوگ جن کی نگاہوں کے سامنے لفظ مسلم کے بعد ایک خشک جامد اور کبھی کبھی زندگی گذارنے والے انسان کی تصویر پھر جاتی ہے، وہ کبھی بھی اقبال کے انسان کامل کا تصور کسی "مسلم" سے نہیں کر سکتے، لیکن اقبال کا مرد مومن دراصل قرآنی نظریہ کا انسان کامل ہی ہے۔

اقبال کے اس مرد مومن اور "مسلم مثالی" کو اس کے ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان سارے انسانوں سے جو شک و ریب میں مبتلا ہیں، ممتاز کر دیتی ہے اور اسی طرح وہ بزدل انسانوں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت و مردانگی اور روحانی قوت سے ممتاز ہے، ایک مسلم کی توحید خالص اسے بندۂ انسان اور بندۂ مال و زر سے علیحدہ کر دیتی ہے اس کی آفاقیت و انسانیت، وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیاز کی جڑ کاٹ دیتی ہے وہ مسلم مثالی زندگی کا ایک پیام رکھتا ہے جس کے ماتحت وہ زندگی گذارتا ہے، زندگی کی قدریں خواہ بدل جائیں اور انسانی زندگی میں کتنا بڑا ہی انقلاب کیوں نہ آ جائے لیکن اسکے اندر نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے، اور نہ وہ خود اپنے آپ کو بدلتا ہے اس مسلم کی مثال قرآن نے اپنے سادہ اور بلیغ لفظوں میں اس طرح بیان کی ہے، "کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" اس کی مثال ایسے پاک درخت کی ہے، جس کی جڑیں جمی ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ اقبال کہتا ہے ۔

نقطۂ پرکار حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

انسان کامل کے اس تصور سے ہمارے ذہنوں میں مسلم کی دو تقسیمیں آتی ہیں، ایک اس کا وجود انسانی ہے، دوسرا اس کا وجود ایمانی! اپنے وجود انسانی میں اس میں اور دوسرے انسانوں میں اشتراک ہے، عام انسانوں کی طرح پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی پروان چڑھتا اور بڑا ہوتا ہے، ہر انسان کی طرح اسے بھوک بھی لگتی ہے، اور پیاس بھی! اسے گرمی کا بھی احساس ہوتا ہے، اور سردی کا بھی، بیمار بھی پڑتا ہے اور صحت مند بھی ہوتا ہے، فقر و غنا میں بھی وہ عام انسانوں کے مثل ہے، زراعت و تجارت اور دوسرے انسانی شعبوں سے بھی اسے دلچسپی ہے، اولاد سے محبت کرتا ہے، اور اپنے پہلو میں بھی دل رکھتا ہے، غرض کردہ اپنے وجود انسانی میں قانون طبعی کا ویسا ہی تابع ہے، جیسے اس کے مثل اور دوسرے انسان! انقلاب زمانہ اور حوادث روزگار اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برت سکتے، محض اس لئے کہ اس کا کوئی خاص نام ہے، اور اس کا تعلق کسی خاص نسل سے ہے یا وہ کوئی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے، بلکہ اس کا وجود اس وسیع کائنات میں صرف ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور عالم کے اس بحر زخار میں اس کی مثال ایک موج کی ہے اگر ایک مسلم بھی عام انسانوں کی طرح زندگی گذارنے پر اکتفا کرے تو پھر اس کی اس کائنات میں کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی اور اس کی موت پر نہ زمین روئے گی اور نہ آسمان ماتم کناں ہوگا اور اس دنیا کی نیرنگیوں میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوگی۔

لیکن اس کا وجود ایمانی اپنے اندر ایک پیام رکھتا ہے، جو انبیاء کا پیام ہے زندگی کے بارے میں اس کے کچھ اصول اور اعتقادات ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے اور

اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے گذرتی ہے، اس حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو وہ حیاتِ انسانی کے اسرارِ سربستہ کا ایک راز ہے، عالم کی بقا کے لئے اس کا وجود ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے، انسانی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے، لہذا وہ مردِ مومن اور مسلم مثالی اس بات کا مستحق ہے، کہ اس کائنات میں زندگی گذارے، پھلے، پھولے اور پروان چڑھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کائنات کی بقا کے لئے اس کا وجود اور اس کا پھلنا پھولنا، پروان چڑھنا ضروری ہے جس طرح اس کائنات کو پانی، ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے، اسی طرح سے ایک مردِ مومن کی بھی ضرورت ہے، اگر حیاتِ انسانی پانی ہوا، روشنی اور حرارت و برودت کے وجود پر منحصر ہے تو اسی طرح ایک ایسے مقصدِ زندگی، روحِ ایمانی اور اخلاق کا وجود بھی ناگزیر ہے، جس کی روشنی انبیاء علیہم السلام کی دعوت و پیام سے حاصل کی گئی ہو اور جس کا بوجھ ایک مردِ مومن کا دوشِ ناتواں اٹھائے ہوئے ہو اور اس کے قیام و بقا کے لئے اپنی زندگی کی ساری قوتوں اور توانائیوں کو لگا رکھا ہو، اس لئے کہ اگر مومن نہ ہو تو یہ پیامِ زندگی اور مقاصدِ بلند ضائع ہو جائیں گے اور ان کا وجود عالم میں ایک رازِ سربستہ بن کر رہ جائے گا، اس مردِ مومن کا وجود و بقا اس عالم میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت آفتابِ جہانتاب کی ہے، اور ان روشن ستاروں کی، نسلیں اور امتیں پیدا ہوں گی اور فنا ہوں گی، آبادیاں ویران ہوں گی اور ویرانے آباد، حکومتیں بنیں گی اور مٹیں گی، ایک تہذیب و تمدن کی جگہ دوسری تہذیب لے گی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا، لیکن اس مسلم مثالی کا وجود ہمیشہ باقی رہے گا۔

اقبال کا مردِ مومن زندہ جاوید ہے، اس لئے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے، اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے، اور اس کی زندگی

ایک زندہ جاوید مقصد کے لئے گذرتی ہے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد ہمیشہ باقی رہے گا اور موت کبھی اسے اپنی آغوش میں نہ لے گی بلکہ اس کی مثال اس بحرِ زخار کی ہے جس کی گود میں موجیں اٹھتی رہتی ہیں، اور فنا ہوتی رہتی ہیں، حیات انسانی کے اس سمندر میں بھی موجیں اٹھتی رہیں گی اور فنا ہوتی رہیں گی، لیکن اس کی حقیقت ہمیشہ باقی رہے گی۔

اقبالؔ کی نگاہ بلند ابھی یہاں پر رکتی نہیں بلکہ اس کی نگاہ کہیں اور پہنچتی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد وجود ہی صرف مردِ مومن ہے، عالم کا وجود اس کے لئے ہے اور وہ صرف اللہ کے لئے، علماء و محدثین کے نزدیک یہ حدیث نبوی "لولاک لما خلقت الافلاک" کی صحت لفظاً اور روایتاً خواہ کیسی ہی مشکوک ہو لیکن اس کی نگاہ حقیقت بیں کچھ اور دیکھتی ہے، وہ قرآن کی روح اور اس کی حقیقت پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے ایک "مسلمان" اور اس کا بلند "پیغام" ہے، وسیع انسانی تاریخ پر اس کی غائر نظر ہے، عالم کی قدروں اور اشیاء کی طبیعتوں کا اسے خوب اندازہ ہے اس لئے یہ حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہے کہ یہ کائنات اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کے لئے وجود میں آئے ہیں، وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے، اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے:۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اور اس عقیدہ و فکر کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے اس پر مسلسل جد و جہد اور کوشش واجب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ عقیدہ و ایمان تھا کہ ایک مسلمان ہوا کے رُخ پر نہیں چلتا بلکہ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے دھارے کا رُخ پھیر دے، عالم کو اپنی راہ پر چلائے، تہذیب و تمدن اور معاشرہ اور سماج کا رخ موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل و ارادہ کے تابع ہو جائے، اس لئے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کیلئے ایک زندہ پیام رکھتا ہے، جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے، اس کے پاس ایمان و یقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے، اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمہ دار ہے، دنیا کی امامت و قیادت اسی کو زیب دیتی ہے، اس عالم میں وہ صاحب امر و نہی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے، سماج اس کا مخالف ہو اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو تو پھر اس کے لئے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانے کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے آپ کو غلط سماج کے سپرد کر دے بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانے کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور معاشرہ اور سماج سے جنگ کرے یہاں تک کہ کامیابی و کامرانی اس کے قدموں پر آ گرے، اقبال کے نزدیک "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نظریۂ زندگی ایک مردِ مومن کیلئے کسی طرح صحیح نہیں، وہ کہتا ہے۔

حدیث کم نظراں ہے "تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اقبال کا خیال ہے، ایک مومن زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرتا ہے، اس کا کام حیات انسانی کی

بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح ہے، اور اس سلسلے میں اسے تخریب سے بھی کام لینا پڑے تو صحیح ہے اور یہ بربنائے تعمیر و اصلاح ہوگا، چنانچہ کہتا ہے:۔

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اقبال کے نزدیک حالات و مصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا و قدر کا عذر پیش کرنا ایک مردِ مومن کا کام نہیں اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں، جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم و ارادہ کے ہیں، مردِ مومن خود تقدیرِ الٰہی ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال نے جب تاریخ عالم پر ایک نگاہ ڈالی تو انھیں نظر آیا کہ صالح انقلاب ہمیشہ "مردِ مومن" کا مرہونِ منت رہا ہے، اور وہی اس کا سرچشمہ ہے، اس کی مثال اس عالم کے مطلع پر ایک صبح سعادت کی سی ہے، وہ انقلاب کا قاید اور زندگی کا پیغامبر ہے، زندگی کی تاریک راتوں کیلئے گویا وہ صبح صادق کا موذن ہے اور اس کی اذان کی آواز عالم کے اس سکوت کو توڑ دیتی ہے، جو اپنے اندر رات کی سی خوفناک خاموشی اور موت کا سا بھیانک سکون رکھتا ہے، اور پھر وہ اذان اس تھکی ہاری نیند کی ماری دنیا کو ایک نشاط اور زندگی بخشتی ہے یہ وہی اذان اور بلند پکار ہے، جو آج سے تیرہ سو برس پہلے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی جس نے اس وسیع کائنات کو ایک گہری نیند سے بیدار کیا جو کہ صدیوں سے مدہوش پڑی تھی، اور یہ اذان مردہ انسانیت اور پریشان حال دنیا کے لئے ایک صورِ قیامت ثابت ہوئی، اور آج بھی اس اذان میں انسانیت کو جگانے اور ضمیرِ انسانی کو

زندہ کرنے کی وہی قوت وطاقت موجود ہے، ضرورت صرف اس مرد مومن کی ہے جو اسی روح بلالی سے پکار دے:۔

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

اور ایک مرد مومن کی اذان ہی اس "سحر" کو نمودار کرے گی جس سے ایک عالم نو" انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوگا۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز　　نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود　　ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ اقبال اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک مرد مومن کی طاقت وقوت، خرق عادت کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی طاقت کے سامنے عقل انسانی حیران ہے بلکہ وہ انسان کے لئے ایک معجزہ سے کم نہیں، وہ اپنے پیغام اور اپنے ایمان ویقین سے اپنے اندر ایک نئی قوت وتوانائی حاصل کرتا ہے اللہ تعالےٰ کی مشیت، قدرت اور قوت قاہرہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے، اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑ روک سکتا ہے اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے، اقبال ایسے ہی مرد مومن کے متعلق کہتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب وکار آفریں کارکشا کارساز
خاکی ونوری نہاد بندۂ مولا صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اسلامی قائد، فاتح اندلس طارق ابن زیاد اندلس کے میدان جنگ میں اپنے پروردگار حقیقی کے حضور میں اسلامی فوج کے لئے دعا گو ہیں، یہ مجاہدین اسلام اقبال کے مرد مومن کی زندہ تصویریں ہیں۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں

اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اقبال کی نگاہ دوررس مردِ مومن کے پوشیدہ طاقتوں کا ندرا اور گہرائی سے اندازہ کرتی ہے، پھر کہتا ہے:-

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے اس قول پر تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں، اور بلاشبہ مومنین صادقین کی مٹھی بھر جماعت نے دشت و دریا، کوہ و صحرا کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں اور قدموں سے روندڈالا اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ اسلامی شہسواروں کے واقعات آج بھی تاریخ کے صفحوں پر ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں، سعد ابن ابی وقاص، خالد ابن ولید، مثنیٰ ابن حارثہ، عقبہ ابن عامر، محمد ابن قاسم، موسیٰ ابن نصیر اور طارق ابن زیاد کے زندہ جاوید کارنامے تاریخ عالم کے مطلع پر ہمیشہ روشن رہیں گے اور یہ اقبال کے قول کی سچی اور عملی تصویریں ہیں۔

اقبال کے نزدیک عالم میں ایک "مسلم" کی حیثیت ایک عالمی حقیقت کی ہے رنگ و نسل اور وطن و ملک کی جغرافیائی حدود میں اسے پابند نہیں کیا جاسکتا، وہ مکان و زمان کی حدود سے متجاوز ہے، علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے خاص انداز میں

یوں ادا کیا ہے ۔

اسکی زمیں بے حدود اسکا افق بے ثغور　　اسکے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اسکے زمانے عجیب اسکے فسانے غریب　　عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق　　بادہ ہے اسکا رحیق، تیغ ہے اسکی اصیل

اقبال کو اس بات پر یقین تھا کہ ایک "مسلم ربانی" کا کوئی محدود وطن نہیں ہے بلکہ سارا عالم اس کا ملک و وطن ہے، اس کے مشرق و مغرب کی کوئی تقسیم نہیں ۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر اسکا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے　　مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کا یہ خیال تھا کہ چونکہ ساری کائنات خدا کی ہے، اور ایک "مومن" صرف خدا کا ہے اس لئے یہ ساری دنیا مرد مومن کا اپنا وطن ہے، اس سلسلہ میں طارق ابن زیاد کے اس زریں واقعہ کو جب کہ اس نے اندلس کی سر سبز و شاداب زمین پر قدم رکھا تو ان کشتیوں کو جن پر کہ وہ آیا تھا جلا دینے کا حکم دیا تا کہ پھر واپسی کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے، فوج کے کچھ لوگوں کو طارق کی حرکت پسند نہ آئی انھوں نے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ہمارا وطن یہاں سے دور ہے اور ہمیں آخر واپس بھی ہونا ہے؟ اس کے جواب میں طارق کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، اس نے تلوار اپنے ہاتھوں میں لی اور کہا کہ اب واپسی کا کیا سوال؟ ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے اس لئے کہ یہ ساری کائنات ہمارے خدا کی ہے اور ہم خدا کے ہیں، اقبال کی شاعرانہ جولانی اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتی ہے :-

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت　　گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم　　ترک سبب ز روئے شریعت کجا روا است

خندید دست خویش بہ شمشیر برد و گفت ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

ایک مردِ مومن "مختلف اور متضاد اخلاق وصفات کا حامل ہوتا ہے، جو اس کی طبعی رنگارنگی اور تنوع پسندی کی آئینہ دار ہوتی ہے، اور وہ مختلف و متضاد صفات دراصل اللہ تعالےٰ کے صفات و احوال کے مظاہر ہیں اور ایک مسلم" اللہ تعالےٰ کے ان صفات کا مظہر ہوتا ہے، مثلاً کشادہ قلبی، عفو و درگذر اور حلم و بردباری میں وہ خدا کی صفت "غفار" کا پرتو ہے، اور اسی طرح دین و حق کے بارے میں شدت، کفر و باطل پر غصہ و غضب میں اس کی صفت "قہار" کا مظہر ہے، اور پاکی و پاکدامنی، پاک نفسی صفت "قدوس" کی آئینہ دار ہے، ایک مسلمان اپنے دین کا ہو بہو نمونہ اور اسلام کی سچی تصویر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ان تمام اخلاق وصفات کا اپنے آپ کو پرتو نہ بنالے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اقبال کہتا ہے، ایسے ہی مردِ مومن کی مثال اس روشن آفتاب کی سی ہے، جس کے لئے غروب نہیں جو ہمیشہ طلوع ہی رہتا ہے، اگر ایک طرف غروب ہوا تو دوسری جانب طلوع ہوا

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اور یہ بات یقیناً سچ ہے تاریخ کے صفحات اس بات پر شاہد ہیں کہ جب کبھی عالمِ اسلام کے کسی حصہ پر مسلمانوں ہی کی کمزوریوں کے باعث کوئی افتاد پڑی تو فوراً ہی اس کی تلافی کسی دوسرے حصہ میں ہوگئی، اگر اسلام کو عالم کے ایک حصہ میں کچھ نقصان پہنچا تو دوسرے حصہ میں

اسے ایک بڑی فتح حاصل ہوئی، اسلام کا اگر ایک ستارہ گردش میں آیا تو مطلع عالم پر ایک "نیا ستارہ" نمودار ہوا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اندلس کا خاتمہ ملت اسلامیہ کے لئے ایک اندوہناک واقعہ اور عظیم حادثہ تھا، لیکن ساتھ ہی یورپ کے قلب پر حکومت ترکیہ کی ایک نئی اسلامی حکومت نمودار ہوئی، غرناطہ کا سقوط اور دولت عثمانیہ کا عروج یہ دو واقعے ہیں، جو ایک ہی زمانہ میں واقع ہوئے تھا تاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی تاریخ اسلام کا بڑا افسوسناک حادثہ ہے، لیکن اسی زمانہ میں ہندوستان کی مسلم حکومت نے ترقی و وسعت اختیار کی اور اس بیسویں صدی کے شروع میں یورپ کے ہاتھوں عالم اسلامی کو سخت چرکے لگے اور یورپ کی حکومتوں نے حکومت ترکیہ کو وراثت کے طور پر تقسیم کر لیا، لیکن ساتھ ہی سارا عالم اسلام جیسے جاگ اٹھا، ذہنی بیداری عام ہوئی، آزادی و حریت کا سیاسی شعور پیدا ہوا اور مختلف اسلامی تحریکیں چل پڑیں، آج ایسا نظر آرہا ہے کہ جیسے سارا عالم اسلام ایک نئی کروٹ لینے کو ہے، دیکھئے پردۂ غیب میں کیا پوشیدہ ہے؟ تاریخ اسلامی ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے، اسلام کا آفتاب اگر ایک افق میں چھپتا ہے، تو دوسرے افق سے اسکی تیز کرنیں نمودار ہوتی ہیں، اور یہ اس لئے کہ اسلام ہی اللہ کا وہ آخری پیغام ہے جو ساری انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے، اس کے بعد اس عالم کے لئے اب کوئی دوسرا پیام نہیں، اور مسلمان اس "پیام" کی حامل آخری امت ہے، اگر یہ ہلاک اور ضائع ہو گئے تو پھر وہ آخری پیغام ضائع ہو جائے گا، اور انسانیت کی کشتی ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کا وجود اس کائنات میں کفر و باطل کے لئے ہمیشہ ایک خطرہ رہا کیا ہے، اور اسلام ہی وہ واحد نظام زندگی ہے، جس کی بقا سارے باطل نظامہائے حیات کے لئے پیام موت ہے کافرانہ نظام زندگی اور ابلیس کی خدائی اسی وقت تک جاری ہے

جب تک کہ اسلامی نظامِ حیات ابھر کر سامنے نہیں آجاتا اور "مردِ مومن" کا کوئی گروہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے لیکن جس دن یہ امت بیدار ہوئی جس کی خاکستر میں شرارِ آرزو پوشیدہ ہے تو پھر ابلیس کی خدائی اور کافرانہ نظامِ حیات نقش برآب ثابت ہو گا، علامہ اقبال نے اپنی بے مثال نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کی ہے، انھوں نے تمثیلی انداز میں یہ بات واضح کی ہے کہ آج ابلیسی نظام کو سارا خطرہ و خوف "اسلام" ہی سے ہے، ابلیس کہتا ہے کہ اسلام کا آئین چشمِ عالم سے پوشیدہ رہے تو اچھا ہے، کیونکہ اسی میں ہماری بقا ہے، اور بسا غنیمت ہے کہ آج خود مومن محروم یقین ہے اور پھر اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ اچھا ہے انھیں الٰہیات اور علم کلام کے مباحث میں الجھائے رکھو تاکہ بساطِ زندگی میں ان کے تمام مہرے مات ہوں اور اسی میں ہماری خیر ہے کہ اس جہان پر اوروں کا قبضہ رہے اور مومن قیامت تک غلام رہے۔ کیونکہ:-

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اقبال کی یہ تمثیلی نظم ابلیس کی زبان میں اس حقیقت کی اچھی طرح پردہ کشائی کرتی ہے کہ اس عالم میں "مسلمان" ہی کا وجود کفر و باطل کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے اور اس کائنات میں پھیلے ہوئے ابلیسی نظام کو اگر کوئی خوف و خطر ہے تو وہ صرف اسلام سے ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باطل پرستوں اور ابلیس کے کارندوں نے اپنی "مسلم دشمنی" کی اس مہم میں کامیابی حاصل کی اور یہ دراصل اسلام اور اس کی آنے والی نئی نسلوں کے خلاف ایک منظم سازش تھی، ان کی سب سے بڑی کوشش یہی رہی کہ مسلمان کی نئی نسلوں کے سینوں میں ایمان و یقین کی جو چنگاریاں دبی پڑی ہیں انھیں جس طرح بھی ہو سکے بجھا دیا جائے

اور عرب و عجم ہر جگہ ان کی جرأت دینی اور جذبۂ اسلامی کو فنا کر دیا جائے کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو ایک مسلمان کو ہر قسم کی قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کرتا ہے بڑے سے بڑے مصائب میں بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوتی بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتا ہے، اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اس حقیقت کی طرف خوب نشاندہی کی ہے:۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

افغانیوں کے غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے آسان اور بہتر راستہ ایسا نظام تعلیم جاری کرنا تھا، جو مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ سے دینی روح، جذبۂ اسلامی اور فکر اسلامی کو یکسر ختم کر دے، اور ان میں ایسا مادی نقطۂ نظر پیدا کر دے جو انھیں مادی زندگی کا رسیا اور عارضی و فانی زندگی کا دلدادہ بنا دے، خود اعتمادی جاتی رہے اور شک و ریب میں مبتلا ہو جائے، اکبر مرحوم نے ایسے ہی نظام تعلیم کے متعلق کہا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اقبال کی نگاہ حقیقت شناس دیکھتی ہے کہ کفر و باطل اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے دینی شعور سارے عالم میں کمزور ہو چکا ہے، ایمان کی چنگاریاں بجھ چکی ہیں، روح جہاد ختم ہو چکی ہے، مادیت اور نفع پرستی کا دور دورہ ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

ذکر عرب کے سوز میں فکر عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اقبال کی طبیعتِ حساس کو جب مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا احساس ہوتا ہے، تو وہ بے چین ہو جاتا ہے، اور خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں، اور اس کی شاعری سے خون دل و جگر ٹپکنے لگتا ہے، اور وہ توحید اسلامی کے اس وارث سے شکوہ سنج ہوتا ہے:۔

اے لاالہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں — گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے — کھویا گیا ہے تیرا، جذب قلندرانہ

اسی قسم کا شکوہ اور دوسری جگہ بھی فرماتے ہیں ۔

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی — اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے — دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں — ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اقبال کے نزدیک اِن تمام خرابیوں کا باعث مومن کا وہ قلب ہے ایمان سے خالی ہو چکا ہے، اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہیں، کہتا ہے:۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اقبال کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودہ حالت و کیفیت عیاں ہے اور وہ اس حالت زار پر بے چین و پریشان اور شکوہ سنج بھی ہے، لیکن چونکہ اقبال یاس و قنوط کا شاعر نہیں، بلکہ امید اور آس، یقین و ایمان کا "پیامبر" ہے، اس لئے وہ مایوس نہیں ہے، اسے اس بات پر یقین ہے کہ عالم اسلام کو جو پیاسی تھپیڑے لگے ہیں،

اس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے، اور ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے اپنی مشہور نظم "طلوع اسلام" میں وہ کہتا ہے:۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی

عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
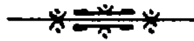
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کی نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ مغربی تہذیب نے اپنا پارٹ اب ادا کر دیا ہے، اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں، اس کے چہرے سے ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہیں، اس عالم میں اس کا وجود اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے، اس کی مثال اس پکے ہوئے پھل کی ہے، جو عنقریب ٹوٹ کر گرنے والا ہو، اس کی جگہ اب ایک نئی تہذیب لینے والی ہے، "عالم پیر" مر رہا ہے اور ایک "جہان نو" پیدا ہو رہا ہے، مگر اقبال کو اس بات پر بھی یقین ہے کہ جب تک اس جہان نو کی امامت و قیادت "مرد مومن" کے ہاتھوں میں نہیں آتی اس وقت تک یہ انسانیت ان فرنگی مقامروں کے ہاتھوں ہلاکت و بربادی سے دوچار ہوتی ہی رہے گی ضرورت ہے کہ "مرد مومن" اٹھے اور ایک "جہان نو" کے بانی کی حیثیت سے موجودہ بیمار انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن کر اسے ایک نئی زندگی اور توانائی عطا کرے ۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ



مردِ مومن کا مقام

مصنف مدظلہ نے مولانا رومؒ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات، پیہم مظالم، اور مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی، اور احساس کہتری پیدا ہوگیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہوگیا تھا، عجمی تصوف نے فنائیت، انکارِ ذات، اور خود شکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خود نگری اور خود شناسی جس پر حرکت، جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول اور لوازمِ بشریت سے گریز، تجرد و تفرید کی تبلیغ اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترکِ انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہوگیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات و شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت کرگئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارے میں

بے اعتمادی، ناامیدی افسردگی، اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی، اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا۔ وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی وسعتوں اور ترقیات سے غافل تھا۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہوگئی اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہوگیا۔ مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔"[1]

اس کے بعد مغربی فلسفہ اور یورپ کی سیاسی و ثقافتی قیادت کا دور آیا جسے نصرانی کلیسا سے رہبانیت کی میراث ملی تھی، اور اس کے ساتھ ہی انسان کے بنیادی طور پر گناہ گار ہونے اور مسیح کا اس کی طرف سے کفارہ بننے کا عقیدہ بھی اس کے حصے میں آیا تھا۔ علاوہ ازیں مغربی معاشرے میں مادی تصور حیات کے تحت انسان کو پیداوار کا ایک بے جان مشین، اور ایک ترقی یافتہ حیوان سمجھا گیا جو صرف اپنے بہیمی تقاضوں کو پورا کرنا اور بازار کے لئے نفع بخش مال تیار کرنا جانتا تھا۔

اس تصور میں انسان کی خیر پسندی اور تمام مخلصانہ جذبات، روحانی اقدار، اور باطنی کائنات سے قطع نظر کر کے اسے اندھی فطرت کے آگے ایک بیچاری اور بے حقیقت مخلوق سمجھا گیا تھا۔

اس تصور کے نتیجے میں مشرقی مسلمانوں میں یاس و بدشگونی، انکار ذات، اپنی قدر و قیمت اور عظمت و شرافت سے وہ جہالت پیدا ہوئی جس کے بعد ان کے ہاتھوں سے قیادت کی باگ نکل گئی اور وہ مغرب کے سیاسی و ثقافتی استعمار کے سائے میں آگئے۔

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت - ۱/۴۰۷

ان حالات نے مغربی تہذیب سے انھیں اس طرح مرعوب و متاثر کیا جیسے موم ذراسی گرمی سے پگھل جاتا ہے، مشرق کے مسلمان سے اپنی ذات اور اپنے مستقبل پر اعتماد ختم ہو کر رہ گیا اور اسے اپنے تمام امکانات ہیچ نظر آنے لگے، وہ مغرب کے مقابلہ میں مادی اور معنوی ہر طرح سے پسماندہ ہوتا گیا ایک طرف اپنی ملت اور اپنے دین پر سے اس کا اعتماد اٹھا اور دوسری طرف ترقی یافتہ معاشرہ قابلِ فخر تہذیب، اور مضبوط حکومتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

ان مجموعی حالات و حوادث نے مشرق کے مسلمان کو وہ "مردِ بیمار" بنا کر رکھ دیا جو خود اپنی ہی نگاہوں میں بے حیثیت اور اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر رہ گیا انھیں حالات میں ایشیا اور افریقہ میں نئے سیاسی نظام، اقتصادی فلسفے، نئے ادبی رجحانات اور نئے شعر و ادب اور تنقید و صحافت نے جنم لیا اور جنھوں نے ایک ساتھ مل کر ایک ہی راگ الاپنا شروع کیا۔

ان سب ہی میں انسان کے ایمان و یقین، اور فرد کی قیمت و حیثیت سے انکار موجود تھا، ان سب نے صاحب ضمیر اور صاحب ایمان انسان کے ابدی پیغام غیر مختتم امکانات و مضمرات اور اس کے اندر حالات کو بدلنے کی معجزانہ قوت سے صرف نظر کیا اس پورے نظام حیات میں مردِ مومن میں چھپی ہوئی ان طاقتوں اور مخفی صلاحیتوں سے چشم پوشی کی گئی تھی جن سے عجائب کا ظہور اور خارق عادت اوصاف کا صدور ہوتا اور جن کے ذریعہ وہ تجربات و مسلمات کو بھی باطل کر دکھاتا ہے۔

مردِ مومن کی اولو العزمی، مہم جوئی، خلوص و بے غرضی، اس کی نزاہت و پاکیزگی مصنوعی معیاروں اور غیر حقیقی قدروں سے گریز، اور غیر فطری خوف و دہشت سے

پرہیز کی قدر کسی سے نہ پہچانی جاسکی۔

مشرقی ممالک کا یہ پورا نظام مغرب کے آگے ہر معاملے میں ہاتھ پھیلاتا دکھائی دیتا تھا، اور اس کی حیثیت ایک طفیلی سے زیادہ نہ تھی، اس میں مغرب کے بوسیدہ نظام و پیام اور فکر و فلسفہ کو جوں کا توں لے لیا گیا تھا، اور اسی عموم میں شخصی اور جمہوری اشتراکی اور اشتمالی کسی نظام حکومت میں کوئی فرق نہ تھا، ان سب میں انسان اور مسلمان دونوں کے بارے میں نقطۂ نظر کا اتحاد موجود تھا جن سے خود یہ نظام قائم ہوتے تھے۔

اس جامد اور یخ بستہ ماحول میں اقبال کھڑے ہوئے اور مومن انسان کے گیت گاتے اور اس کا کلمہ پڑھتے ہیں، اور اس کے اندر نخوت اور احساس عظمت، ذات کی معرفت اور خود اعتمادی کی قوت بیدار کر دیتے ہیں اسے کائنات اور عالم انسانی میں اپنے مقام سے آگاہ کر کے اور مایوسی اور ناامیدی سے نکال کر امید و آرزو، جہد و عمل مہم جوئی اور دشوار طلبی، سیادت و قیادت، پیش بندی اور خود بینی، اعزاز و اہتزاز، بلند کرداری و نادرہ کاری کی دنیا میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

وہ اپنی فارسی غزل میں "مومن" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

"تجھ پر مجھے کمال حیرت ہے کہ آفاق تو تجھ سے روشن ہیں لیکن تیری ذات ہی درمیان سے غائب ہے تم کب تک غفلت و بطالت، گمنامی و جہالت کی زندگی گذارتے رہوگے تمہاری روشنی نے دنیائے قدیم کو روشن کیا اور تمہارا وجود ماضی کی تاریک رات کے لئے منارۂ نور بن کر رہا، تمہاری آستین میں ہمیشہ "ید بیضا" موجود رہا تم آج گھروندوں میں گھوم رہے ہو، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ تم انھیں پھلانگ بھی سکتے ہو تم تو اس وقت بھی تھے جب یہ کائنات نہ تھی، اور اس وقت بھی

رہو گے، جب یہ نہ ہو گی، اے مرد جاوداں! تو موت سے ڈرتا ہے حالانکہ موت کو تجھ سے ڈرنا چاہیے موت نہیں بلکہ تم اس کی گھات میں ہو تمہیں جاننا چاہیئے کہ آدمی کی موت روح کی جدائی سے نہیں ہوتی بلکہ ایمان کی کمی اور یقین سے محرومی سے ہوتی ہے۔

بینی جہاں را خود را نہ بینی! — تا چند ناداں غافل نشینی؟
نور قدیمی، شب را برافروز — دستِ کلیمی در آستینی!
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق — تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید — مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند — آدم بمیرد از بے یقینی!
صورت گری را از من بیاموز — شاید کہ خود را باز آفرینی[۱]

اپنی ایک دوسری نظم میں جو موسیقی کا زیر و بم لئے ہوئے ہے اور جو مسلم نوجوانوں کے لئے بیداری کا ایک نغمہ ہے اس میں وہ اس "مرد مومن" کو آواز دیتے ہیں جو مایوس و نومید ہو کر زندگی کے کارواں اور قیادت و امامت کے منصب سے بچھڑ گیا ہے وہ کہتے ہیں۔

اے خوابیدہ کلی تو اس نرگس بیدار کی طرح آنکھ کھول جس کی آنکھیں کبھی نہیں جھپکتیں اور جسے کبھی نیند نہیں آتی، دشمنوں نے ہمارے مستقر پر حملہ کیا ہے اور ہمیں خانماں برباد کر کے رکھ دیا ہے ——— کیا بلبل کی نغمہ سنجی، اذان کی للکار اور قلب و روح کی پکار بھی تمہیں بیدار نہیں کر سکتی۔

آفتاب نے پھر از سر نو رخت سفر باندھا اور ظلمات کے سمندر میں صبح روشن

---

[۱] زبور عجم ۱۴۲.

کے تو ادھر حرکت میں آ گئے کارروانوں نے وادیٔ صحرا میں اپنے اسباب اٹھائے اور کوچ کا نقارہ بج گیا، لیکن اے چشم بیدار! جو انسانیت کی نگراں اور کمزوروں کی پاسباں تھی، تو ابھی تک سو رہی ہے، اور ذرا نہیں دیکھتی کہ حالات و حوادث میں کیا انقلاب آ گیا؟

تیرا سمندر صحرا کی طرح ساکن ہو گیا ہے، اور جوش و طغیانی کی جگہ اس میں جمود پیدا ہو کر رہ گیا ہے، اس میں کوئی مدوجزر نہیں، اس کی موجوں میں کوئی تلاطم نہیں، یہ کیسا سمندر ہے جس میں نہ کوئی نہنگ حوصلہ مند ہے نہ کوئی موج بلند! تمہارے پرشور سمندر کو تو اپنے ساحل سے نکل کر دشت و جبل میں پھیل جانا تھا! اے مردِ مومن! وطن مٹی کا جسم ہے لیکن روح کا وجود دین و مذہب سے ہے، اس لئے تمہیں ایک ہاتھ میں "خدا کا کلام" اور دوسرے میں "تیغ بے نیام" لیکر اٹھنا چاہیئے اس لئے کہ ان دونوں کا اجتماع ہی بشریت کی سعادت ہے اور تہذیب کے لئے برکت۔

اے مردِ مسلماں! تو ناموس ازل کا امین و پاسباں اور خدائے لم یزل کا راز داں ہے تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے، تیری اٹھان مٹی سے ہے لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقا متعلق ہے، میخانۂ یقین سے پی اور ظن و تخمین کی پستیوں سے بلند ہو جا، فرنگ کی دلداری کی نہ داد ہے نہ فریاد، جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور ناکارہ بنا دیا ہے فریاد ان بازیگروں سے جو کبھی نازو انداز سے پکڑتے، اور کبھی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں کبھی شیریں کا پارٹ ادا کرتے، اور کبھی "پرویز" کا روپ بھرتے ہیں، دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویرانہ ہو گئی ہے، اے بانیٔ حرم! اے معمار کعبہ!! اور اے فرزند ابراہیم ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لئے اٹھ اور اپنی گہری نیند سے بیدار ہو۔"

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز کاشانۂ ما رفت بتاراج غماں خیز

از نالۂ مرغ چمن از بانگِ اذاں خیز　　از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز!
خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست　　آویزہ بگوشِ سحر از خونِ جگر بست
از دشت و جبل قافلہ ہا رختِ سفر بست　　اے چشمِ جہاں بیں بہ تماشائے جہاں خیز!
خاور ہمہ مانندِ غبارِ سرِ راہے است　　یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہے است
ہر ذرۂ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است　　از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز!
دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست　　دریائے تو دریاست کہ افزوں نشد و کاست
بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست　　از سینۂ چاکش صفتِ موجِ رواں خیز!
ایں نکتہ کشایندۂ اسرارِ نہاں است　　ملک است تنِ خاکی و دیں روحِ رواں است
تن زندہ و جاں زندہ ز ربطِ تن و جان است　　با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز!

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز!　　(از خوابِ گراں خیز ۴۶)

وہ اپنی ایک اردو غزل میں کہتے ہیں جو رقت و حلاوت میں اپنی مثال آپ ہے:۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی　　کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے　　جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں　　وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی
تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری　　نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا　　لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

وہ اپنی ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں جو سہل ممتنع کی ایک مثال ہے ۔

اے مردِ مومن! اس کائنات کے تمام مناظر و مظاہر، تمام اجرامِ فلکی اور اجسامِ ارضی زوال آمادہ اور فنا پذیر ہیں، لیکن تو ان کے درمیان جاوداں ہے، تمہارے اردگرد کی ہر شئے

تمہاری تابع اور ماتحت ہے لیکن تم نے اپنے کو نہیں پہچانا تم دنیا کے پیچھے کب تک چلتے رہوگے؟ یا تو اسے ٹھکرا دو یا پھر اسے اپنے آگے جھکا دو، درمیان کی راہ کوئی نہیں ہے۔

ہر شے مسافر ہر چیز راہی   کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
تو مرد میداں تو میر لشکر   نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی   یہ بے سوادی یہ کم نگاہی!
دنیائے دوں کی کب تک غلامی   یا راہبی کر یا پادشاہی[1]

یہ ایک ہلکا نمونہ تھا ورنہ اقبال کا پورا کلام ہی ان نمونوں کا حامل ہے جس میں مردِ مومن اور مسلم نوجوانوں کو اس تہذیب کے خلاف ہوشیار کیا گیا ہے جس کی نگاہ میں یہ دنیا قلب و روح اور بشری امکانات کی دنیا نہیں بلکہ تجارت کی منڈی، شراب کی بھٹی اور قمار خانہ عہد وں کی کشمکش کا اکھاڑا اور قیادت و سیادت کی رزم گاہ ہے۔



---

[1] بالِ جبریل ۸۰

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

اقبال کے آخری مجموعۂ کلام "ارمغانِ حجاز" میں ایک نادر الاسلوب نظم مذکورہ بالا عنوان سے ملتی ہے، جس میں اقبال نے ایک شیطانی پارلیمنٹ کا نقشہ کھینچا اور دکھایا ہے کہ اس میں دنیا کے ابلیسی نظام کے ممتاز نمائندے شریک ہوتے ہیں، اور ان رجحانات تحریکات اور سیاسی نظریات کا جائزہ لیتے ہیں جو ان کی مہم کی راہ میں رکاوٹ اور ان کے مساعی و مقاصد کے لئے سنگ گراں ہیں، اس میں ابلیس کے مشیر اپنی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اور پھر صدر جلسہ ابلیس ان سب رایوں کو دیکھ کر ان پر تبصرہ کرتا اور اپنے وسیع تجربات اور جہاں بینی کی روشنی میں اپنی آخری رائے دیتا ہے، وہ رائے ایسی ہے جس تک اسکے کسی شاگرد کی نظر نہیں پہنچتی اور سب اس پر صاد کرتے ہیں۔

اس کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ "دنیا میں مسلمان ہی اس کا واحد مقابل اور جانی دشمن ہے، جو اس کے شیطانی نظام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے، مسلمان ہی وہ چنگاری ہے جو کسی وقت بھی بھڑک کر آتش شعلہ فشاں بن سکتی ہے۔

اس لئے مصلحت اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی تمام طاقتیں اسی دشمن نمبر ایک کے مقابلے پر لگادی جائیں اور اگر اسے ختم نہ کیا جاسکے تب بھی اس کا زور توڑ دیا جائے یا اس پر غفلت کی نیند ہی طاری کر دی جائے۔

اس نظم میں مسلمان کی تصویر اس کے نازک خط و خال کے ساتھ کھنچ گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے افکار و مذاہب و نظریات اور ان کے قائدین پر بھی روشنی پڑگئی ہے ـــــ نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

شیطان اور اس کے مشیر ایک مجلس شوریٰ میں جمع ہو کر عالمی مسائل اور مستقبل کے خطرات کا جائزہ لیتے ہیں، جو ابلیسی نظام اور شیطانی پروگرام کی راہ میں آنے والے ہیں اور ان کے لئے سب سے بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شیطان کے مشیر اسلامی نظام سے پہلے دوسرے نظام ہائے فکر کا نام لیتے ہیں، سب سے پہلے ابلیس حاضرین کو خطاب کرتا ہے:۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں — ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
اسکی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز — جس نے اسکا نام رکھا تھا جہانِ کاف نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کرسکتا ہے اسکی آتشِ سوزاں کو سرد — جسکے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جسکی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند — کون کرسکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

اس تقریر کے بعد پہلا مشیر کہتا ہے کہ ابلیسی نظام کے استحکام میں کیا شک ہو سکتا ہے، اس نے تو شاہ و گدا سب کو جکڑ ہی رکھا ہے عوام غلامی پر راضی ہیں اور اپنی پستی پر

خوش وخرم ان کے دل بے ذوق ہیں، جن میں کوئی آرزو سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو تمنائے خام بن کر رہ جاتی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ ہماری مسلسل تگ و دو اور سعیٔ پیہم کا نتیجہ ہے کہ صوفی و ملّا جنھیں مسلم عوام کی قیادت حاصل ہے، ان کی اکثریت ملوکیت پر راضی ہو گئی ہے، روحانیت، تزکیۂ نفس، صفائی باطن، تصوف و عرفان اور تقویٰ و احسان کو اب صوفی صرف قوالی، رقص و وجد، سرود و سماع اور "حال" آنے تک محدود سمجھتا ہے اور اس کے احوال و مقامات کی دنیا اس سے آگے نہیں، اسی طرح ملّا یا عالم دین کا سارا علم و نظر کلامی بحثوں، الٰہیات کے مسائل، مناظروں اور الٹی سیدھی تقریروں تک محدود ہے، جن لوگوں کو عوام کی دینی اور پھر سیاسی رہنمائی کرنا تھی، وہ خود ملوکیت اور باطل حکومتوں کے غلام اور بندۂ بے دام بن کر رہ گئے ہیں، مذہب کے ظاہری رسوم کسی حد تک باقی ہیں، حج و طواف کی نوبت بھی سیر و تفریح کے ساتھ کبھی آ جاتی ہے، لیکن وہ جہاں بانی اور حکمرانی کے تمام آداب بھلا بیٹھے ہیں، اور ان کی تیغِ بے نیام کند ہو کر رہ گئی ہے، اور ان کی نومیدیٔ جاوید کا یہ حال ہے کہ اب گویا حرمتِ جہاد پر اجماع ہو گیا ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام   پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود   ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں،   ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج!   صوفی و ملّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی   ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا   کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید   ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام

دوسرا مشیر جمہوریت کو سب سے بڑا خطرہ بتاتا ہے۔

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

اس پر پہلا مشیر کہتا ہے کہ مجھے تو جمہوریت سے کوئی خطرہ نہیں محسوس ہوتا ہیں تو اسے ملوکیت ہی کا ایک دلآویز پردہ سمجھتا ہوں جس میں اس کا مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے آخر ہمیں نے تو شاہی کو جمہوری لباس پہنایا ہے اس طرح وہ ہمارا ہی پروردہ ہے۔

جب انسان ملوکیت کے جبر سے اکتا کر متنبہ اور بیدار ہونے لگتا اور اپنی عزت و خودداری سمجھنے لگتا ہے، اور ہمیں اپنے نظام کے لئے جب کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے، تو ہم اسے جمہوریت کا کھلونا دے کر بہلانے کی کوشش کرتے ہیں، میر و وزیر ہی صرف بادشاہی کے نمائندے نہیں بلکہ اس کی بے شمار صورتیں ہیں، ملوکیت کسی فرد اور شخص ہی پر منحصر نہیں ہوتی، ملوکیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کی محنت کا استحصال کرے اور جور و جبر یا حیلۂ و مکر سے دوسروں کے مال و متاع پر غاصبانہ نظر ڈالے، اس میں فرد و جماعت کسی کی تخصیص نہیں، مغرب کا جمہوری نظام بھی اس سے بری نہیں اس کا چہرہ ضرور روشن ہے، لیکن اس کا باطن چنگیز و ہلاکو سے زیادہ تاریک اور بھیانک ہے۔

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو، اس کیا خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اس وضاحت اور تسلی کے بعد تیسرا مشیر اطمینان کی سانس لیتا ہے اور کہتا ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو ملوکیت کی روح باقی رہنے سے بھی کوئی حرج نہیں لیکن اس فتنۂ عظیم کا کیا جواب ہے، جو اس فتنہ پرداز اور خانہ برانداز یہودی "کارل مارکس" کی ایجاد ہے جو نبی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کامریڈوں کے نزدیک کسی نبی سے کم نہیں، اس کی ذات انقلابی ضرور تھی، لیکن وہ آسمانی ہدایتوں سے محرومی کے باعث کلیم بے تجلی، اور مسیح بے صلیب بن کر رہ گیا اور دنیا کو کوئی صحیح راہ عمل (WAY OF LIFE) نہیں دے سکا وہ ہر مذہب کا منکر اور ہر کتاب ہدایت سے باغی ہے، لیکن اس کی CAPITAL کیمونسٹوں کی نظر میں کسی آسمانی صحیفہ سے فروتر نہیں اور کمیونزم سارے مذاہب کا انکار کرتے ہوئے بھی خود ایک مذہب بن بیٹھا ہے، اور دنیا میں ایک تہلکہ مچا رکھا ہے طبقاتی کشمکش پیدا کر کے امیر و غریب بورژوا اور پرولتارین کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور قوموں کے درمیان نفرت و عداوت کا بیج بو دیا ہے۔

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے، ساحران فرنگ اگرچہ آپ ہی کے چیلے اور عقیدتمند مرید ہیں، لیکن اب مجھے انکی فراست پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں، وہ سامری یہودی (کارل مارکس جو ایرانی اشتراکی لیڈر مزدک کی روح کا ظہور ہے) دنیا کو تہ و بالا کئے دے رہا ہے، اس نے وہ سحر کیا ہے کہ ہر چھوٹا اپنے بڑے کی پگڑی اچھالنے پر تلا ہوا ہے، اور

چور اچکے بھی بادشاہوں کی برابری اور ہمسری کا دعوا کر رہے ہیں ، ہم نے شروع میں تو اس فتنہ کو چھوٹا سمجھ کر اس کی خبر نہ لی لیکن اب اس کا خطرہ بڑھتا ہی جاتا ہے ، اور مستقبل کے اندیشوں سے زمین کانپ رہی ہے آپ کی سیادت و قیادت کی بساط ہی الٹی جا رہی ہے ، اور وہ دنیا ہی اس قیامت کی نذر ہو رہی ہے ، جس پر آپ کی حکمرانی قائم ہے ۔

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام　　اب مجھے انکی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بروز　　ہر قبا ہونے کو ہے اسکے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ　　کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعت افلاک پر　　جسکو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشت غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج　　کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے　　جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

آخر میں ابلیس اپنے مشیروں کو مخاطب کر کے اپنی آخری رائے دیتا اور اپنا قطعی فیصلہ اور پروگرام سب کے سامنے رکھتا ہے ، اور کہتا ہے کہ ان تحریکات اور نظریات سے کچھ نہیں ہو سکتا اصل عالمی اقتدار اب بھی مرے پنجۂ اختیار میں ہے دنیا کے ہر اتار چڑھاؤ اور سیاسی اتھل پتھل میں میرا ہاتھ ضرور رہتا ہے ، جہاں میں نے قوموں اور ملکوں کو آپس میں لڑا دیا اور خصوصاً اقوام یورپ کا لہو گرمایا تو دنیا میری طاقت کا اندازہ لگا لے گی ، انسان حیوانوں کی طرح ایک دوسرے پر غرّائیں گے اور بھیڑیوں کی طرح ایک دوسروں کو پھاڑ کھائیں گے میں ذرا کان بھر دوں تو یورپ کے لاماں سیاست کلیسا کے مقدس پوپ کی روحانیت اور ذہانت دھری رہ جائے اور دیوانگی اور مخبوط الحواسی کی وحشت ان پر طاری ہو جائے ۔ اور

غصہ میں اندھے ہو کر مجنونانہ حرکتیں کرنے لگیں:۔

اشتراکیت سے مجھے اس لئے خطرہ نہیں محسوس ہوتا کہ وہ فطرت کے خلاف جنگ کرتی ہے اور انسانوں کے درمیان جو طبعی فرق ہے اسے منطق کے زور سے مٹانا چاہتی ہے، یہ سرپھرے اور لاخیرے مجھے کب ڈرا سکتے ہیں:۔

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بتو

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب
میں نے جب گرما دیا اقوامِ عالم کا لہو

کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھکو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ مو

ابلیس سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر واقعی مجھے کسی سے خطرہ ہے تو امت مسلمہ اور ملت محمدیہ سے ہے، جس کی خاکستر میں نئی زندگی کے شرارے اور عزم و ہمت کے انگارے چھپے اور دبے ہوئے ہیں، جس کی رسی جل گئی ہے مگر اس کے بل نہیں گئے، یہ امت اگرچہ جماعتی حیثیت سے پس ماندہ ہو گئی ہے، لیکن اس میں باشعور و باصلاحیت افراد اور عبقری شخصیتوں کی کمی نہیں، اس کا ملی شیرازہ برہم ضرور ہے، لیکن رجال کار اور مردانِ غیب کی اس میں اب بھی کمی نہیں جو شکست کو فتح سے بدلنے، ہاری ہوئی بازی کو جیتنے اور ڈوبی ہوئی کشتی کو ترانے کی اہلیت اور ہمت رکھتے ہیں، اس قوم میں ایسے اصحاب عزیمت و استقامت اب بھی موجود ہیں جن کی سحر خیزی و شب بیداری ہنوز برقرار ہے، ان کی راتیں سوز و گداز، عرض و نیاز میں بسر ہوتی ہیں، جو اشکِ سحر گاہی سے

وضو کرتے ہیں، اور دعائے نیم شبی اور نالۂ سحرگاہی جن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، اس لئے زمانہ شناس جانتا ہے کہ اسلام ہی کل کا فتنہ اور مستقبل کا خطرہ ہے، اشتراکیت نہیں۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے ۔۔۔ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ ۔۔۔ کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے ۔۔۔ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

ابلیس اپنے خیالات اور خدشات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ امت قرآنی پروگرام کی حامل اور اس پر عامل نہیں، مال کی محبت، ذخیرہ اندوزی اور نفع رسانی کے بجائے نفع طلبی اور سرمایہ داری اس کا بھی مذہب بنتی جارہی ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مشرق کی رات اور اس کا مستقبل بہت تاریک ہے، اور علمائے اسلام اور رہنماؤں کے پاس وہ روشنی نہیں جس سے تاریکیاں دور اور اندھیاریاں کافور ہو جاتی ہیں، ان کی آستین "ید بیضا" سے خالی اور ان کی جماعت کسی مسیحا نفس سے محروم ہے ــــ ــــ لیکن زمانے کے انقلابات اور مقتضیات سے مجھے خطرہ ہے کہ وہ کہیں اس امت کی بیداری کا سامان نہ بن جائیں اور وہ پھر سے دینِ محمدی کی طرف بازگشت نہ کرنے لگے، "دینِ محمدی" اور شرعِ اسلامی کی ہمہ گیری اور کارسازی کا تمہیں اندازہ نہیں ــــ یہ "آتشیں شریعت" خاندانی نظام، مرد وزن کے حقوق کی حفاظت و صیانت اور صالح معاشرہ کی تعمیر کرتی ہے، یہ دین عزت و حرمت، امانت و عفت، مروت و شجاعت، کرم و سخاوت اور تقویٰ و طہارت کا دین ہے، یہ دنیا سے باطل کی ہر غلامی اور انسانوں کے ساتھ ہر ناانصافی کو مٹا کر رکھ دیتا ہے، اس میں شاہ و گدا، وزیر و فقیر اور اونچ نیچ کا کوئی امتیاز نہیں، اس کا نظام زکوٰۃ مال کے بارے میں متوازن نظریہ

رکھتا ہے، اور سرمایہ داروں کے مال کو بھی اللہ کی امانت اور غریبوں کا حق کہتا ہے، اور فکر و عمل کی دنیا میں اس نے اپنے اس نظریے سے انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ زمین اللہ کی ہے، بادشاہ و سلاطین کی نہیں، اس لئے پوری کوشش ہونی چاہیے کہ یہ دین نگاہوں سے پوشیدہ رہے، اور اس کی خوبیاں چھپی رہیں، ہمارے لئے یہ امید افزا علامت ہے کہ مومن خود ایمان سے محروم ہے، اور الٰہیات و تاویلات میں الجھا ہوا ہے، اس امت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رہو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جاگ اٹھے اور اپنی تکبیروں سے فسانہ و افسوں، اور شیطانی سحر و طلسم کے تار و پود بکھیر دے، اس پر پورا زور لگنا چاہئے کہ شام زندگی شب زندگی میں بدلے لیکن صبح کا اجالا نہ پھیل سکے، مومن کو جہد و عمل کی رزمگاہ سے الگ تھلگ ہی رکھو تاکہ زندگی کے ہر محاذ پر وہ ناکام ہی ہوتا رہے، اور بساطِ عالم پر اپنا رول نہ ادا کر سکے، عالمِ اسلام کی غلامی استعمار کے لئے ضروری ہے اور اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ شعر و تصوف توکل اور ترک دنیا کا افیون اسے دیتے رہا جائے، خانقاہی مزاج، اوہام و خرافات اور رسم و رواج کا یہ جسقدر پابند اور رہبانیت پر جتنا کاربند ہوگا اتنا ہی عالم کردار سے دور رہے گا —— پھر سن لو کہ اس امت سے اور اس کی بیداری سے میں اس لئے ڈرتا ہوں کہ اس کی بیداری کا مطلب ایک قوم کی بیداری نہیں بلکہ دنیا کی بیداری کے ہیں، اس قوم میں ذات و کائنات دونوں کا رشتہ جڑا ہوا ہے، اور جہاں اس میں احتساب نفس ہے وہیں احتساب کائنات بھی!

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن مرد آزما مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں!

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

توڑ ڈالیں جسکی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی پہ اسکے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جسکے دیں کی احتسابِ کائنات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

(ارمغانِ حجاز)

شرارِ بولہبی در پئے چراغِ مصطفوی

بالفرض اگر دنیا کی شیطانی تحریکات اور ابلیسی نظریات کامیاب ہو جاتے ہیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ کوئی پروگرام بنانا چاہیں، تو ان کے مقاصد میں سرِ فہرست یہی ہوگا کہ ایمان کی اس چنگاری کو بھی بجھا دیا جائے جو خاکستر ہونے کے قریب پہنچ چلی ہے ان کی سب سے پہلی کوشش یہی ہوگی کہ عرب و عجم کے دلوں سے دینی حمیت اور اسلامی غیرت کو

نکال باہر کیا جائے جن کے سبب ان میں قربانی اور جہاد کا جذبہ کبھی بیدار ہوا اٹھتا ہے، جس سے وہ باطل سے بغاوت کر کے خدا طلبی کی راہ پر چل پڑتے ہیں، اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں شیطان کہتا ہے، جو مجاہد فقر و فاقہ سے بھی نہیں ڈرتا اور نہ موت سے خوف کھاتا ہے، اسے مصائب سے ڈرانے اور موت سے دھمکانے کے لئے ضروری ہے کہ روحِ محمدؐ اس کے قلب و قالب سے نکال دو اور عربوں کی مرکزیت اور ان کی سادہ فطرت و عربیت ختم کرنے کے لئے ان میں لادینی افکار و فلسفہ کی اشاعت کرو، اہل حرم سے ان کی دینی میراث غصب کر لو جس کے ذریعہ تم اسلام کو گہوارۂ اسلام — حجاز و یمن — سے بھی نکال سکتے ہو، اور دیکھو ان شورہ پشت اور سخت جان افغانوں میں دینی غیرت اب تک چلی آ رہی ہے، اس کے لئے تمہیں وہاں کے علما اور دیندار طبقہ سے نمٹنا ہو گا۔

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں — زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو!
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا — روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج — ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو — آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز — ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

اس مقصد تک پہنچنے کا راستہ تعلیم ہی ہو سکتی تھی جو مسلم کو اسلامی فکر و روح اور دینی جذبات سے خالی کر کے اس میں نفع اندوزی و لذتیت، دنیا پرستی اور سطحیت، مسرت کی ہوس اور دولت کی حرص، مادہ اور مادہ پرستوں کی عظمت، اخلاقی انحطاط، بے اعتمادی

اور ریب و تشکیک اور بے دینی و الحاد کے جراثیم داخل کر دے جیسا کہ اکبر نے اس نظام تعلیم کی ہلاکت آفرینی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

دینداروں میں بھی دینی روح کا فقدان

اقبال کا خیال ہے کہ عالم اسلام میں باطل پسند تحریکیں اپنے اسلام دشمن پروگرام میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوتی رہی ہیں جس کے سبب دینی شعور کی کمی حرارتِ ایمانی کا ضعف، غیرت اسلامی کا فقدان، اور روحِ جہاد کی کمیابی عام ہوگئی، اور نفع طلبی اور مادہ پرستی کے سیلاب نے عالم اسلام کے جزیرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا شاعر بلادِ اسلامیہ کے مشاہدہ اور جائزہ کے بعد کہتا ہے کہ میں نے عرب و عجم میں ہر جگہ گھوم پھر کے دیکھا.... ابولہب کے نمائندے تو ہر جگہ نظر آئے لیکن روحِ محمدؐ سے سرشار لوگ کبریتِ احمر اور عنقا سے بھی زیادہ کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفٰےؐ نایاب و ارزاں ابولہب!

وہ اپنی دوسری نظم میں کہتے ہیں کہ اب بلاد عربیہ میں اس سوز دروں کی فضا نہیں ملتی جس کے لئے عرب ہمیشہ سے ممتاز رہے ہیں، اور نہ عجم میں وہ رعنائی افکار نظر آتی ہے جو اس کا طرۂ امتیاز رہی ہے گیسوئے دجلہ و فرات اگرچہ تابدار ہیں، اور حق و باطل کا وہی معرکہ برپا ہے، لیکن قافلۂ حجاز میں کوئی حسینؓ نظر نہیں آتا۔

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں | بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات
ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں | نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں | گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
(ذوق و شوق)

اقبال مسلمانوں کی زندگی میں اس زوال و اضمحلال کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں، وہ اپنی نظم میں توحید کے علمبردار کی غیرت کو جھنجوڑتے ہیں، اور کہتے ہیں:۔ اے اسلامی توحید کے وارث! نہ تیرے پاس وہ کلام ساحر ہے جس سے تو دلوں کو موہ لیتا تھا، نہ وہ عمل قاہر ہے جس سے سرکشوں کو مسخر کرتا تھا کبھی تم وہ تھے کہ تمہاری نگاہ مرد افگن اور صاعقہ فن تھی اور آج نہ تم میں وہ روح ہے، اور نہ وہ جذب و کشش:۔

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں | گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ!
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے | کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ
(بالِ جبریل)

دوسری جگہ بڑے حسرت آمیز انداز میں کہتے ہیں کہ مردِ مومن کا وہ سجدۂ شوق جس سے کبھی روحِ زمیں وجد میں جھوم اٹھتی تھی اور کبھی اس کی گرانمائیگی سے کانپ جاتی تھی منبر و محراب مدت سے اسی سجدے کو ترس رہے ہیں، اور اسی کی یاد میں تڑپ رہے ہیں —— لیکن خلافِ امید مصر و فلسطین میں بھی گوشِ مشتاق اس اذان کو ترستا ہی رہا، جس سے پہاڑ بھی لرز اٹھے تھے ـ

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی | اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے | دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
(بالِ جبریل)

اور کہیں تو ان جیسے رجائی شاعر کو بھی مایوس ہو کر کہنا پڑتا ہے:۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے | مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف
(بال جبریل)

اور کہیں اس کی فلسفیانہ توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں میں حبِ صادق اور عشقِ حقیقی کی چنگاریاں باقی نہیں ہیں، اور ان کے جسم میں خونِ زندگی بھی نہیں رہ گیا، وہ لاشۂ بے جان بن کر رہ گئے ہیں، ان کی اجتماعیت کی صفیں درہم برہم ان کے دل ایک دوسرے سے پھرے ہوئے ان کے سجدے بے ذوق و شوق بن کر رہ گئے ہیں، اور یہ سب اس لئے ہے کہ ان میں روحِ اجتماعی اور قلب کی والہانہ کیفیت نہیں ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے
(بال جبریل)

نشأۃ ثانیہ

لیکن اقبال اپنی امید کیشی، آرزو مشربی اور رجائیت کے پیشِ نظر یہ توقع ظاہر کرتے ہیں کہ سیاسی صدمات اور مصائب اور حوادث و آلام نے اگرچہ عالم اسلامی کو گھیر لیا ہے، لیکن اس سے وہ بیدار بھی ہو گیا ہے، اور اس میں نئی زندگی اور تازگی کے آثار پیدا ہو چلے ہیں، وہ اپنی نظم طلوعِ اسلام میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ستاروں کی کم تابی اس کی دلیل ہے کہ افسونِ شب ختم پر ہے اور پو پھٹنے والی ہے، اور صبح نو اس بات کی دلیل ہے کہ خورشید جہاں تاب نکلنے ہی والا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حوادث و افکار نے مسلمانوں میں جذبۂ اسلامی اور خود شناسی کا ولولہ پیدا کر دیا ہے، اور طوفانِ کفر نے اس کو اپنے ایمان پر اور مضبوطی سے جما دیا ہے، اور مشرق میں مغرب کے چیلنج کے اثر سے

شدید ردِ عمل پیدا ہو چلا ہے، یہ جوشِ ایمانی اور محبت اخوانی ابن سینا و فارابی اور جدید منطق و عقل کے دائرہ سے باہر ہے۔

اور یہ آثار ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی نطق اعرابی، اور ان کی عظمتِ رفتہ واپس ملنے والی ہے ۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی ۔ افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا ۔ سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے ۔ تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے ۔ شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی فطرت سیمابی اور ان کی طبیعت سراپا بے تابی ہے وہ اگر آج اس کروٹ ہیں تو کل بیداری کی کروٹ بھی بدلیں گے ۔ ع

جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی!

ان کی نگاہ میں سرشکِ چشمِ مسلم، صرف آنسو نہیں بلکہ ابرِ نیساں ہے جس سے دریائے خلیل میں لعل و گہر پیدا اور سیراب ہوتے ہیں، مسلمان ان کی نظر میں خدائے لم یزل کا دستِ قدرت اور زبان ہے، اور ستارے بھی اس کے کارواں کی گرد راہ ہیں، وہ چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے، اس لئے جاوداں اور ازل ابد پر محیط ہے، اور اس کی فطرت، ممکناتِ زندگی کی امین اور وہ اشیاء کا پاسبان ہے، اسلام اور زندگی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس لئے مسلمان کی نشاۃ ثانیہ بھی نوشتۂ تقدیر ہے ۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اقبال مایوس کن مشاہدات اور تجربات کے باوجود ملت اسلامیہ سے کبھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ اس کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے پیش نظر یہی کہتے رہے:۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مسلمان، عالم نو کا بانی و معمار!

اقبال کا یہ خیال ان کے ایمان و یقین کے درجہ پر تھا کہ مغربی تہذیب اپنا رول ادا کر چکی اور اس کا وقت پورا اور اس کا ترکش خالی ہو چکا اور اب وہ بڑھاپے کی منزل میں ہے وہ اس پکے ہوئے پھل کی طرح ہے، جو ٹوٹ کر گرنے والا ہے ۔

تاکمیں مدت سے بیٹھے ہیں یہودی سودخوار — جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح — دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ
(بال جبریل)

ان کے خیال میں عالم پیر نزع کے عالم میں ہے اس کی موت یقینی ہے:۔

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات — خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا — قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ عالم قدیم جس میں یورپ کے جواری ہار جیت کی بازی لگا رہے ہیں وہ بنیاد ہی سے مٹنے والا ہے، اور اس کی بنیادوں پر ایک نئی دنیا کی تعمیر ہونے والی ہے، اقبال کہتے ہیں کہ اس دنیا کی تعمیر بھی وہی کر سکتا ہے جس نے انسانیت کے لئے دنیا میں بیت الحرام بنایا تھا، اور ابراہیمؑ و محمدؐ اس کے وارث ہوئے تھے، اور دنیا کی قیادت کا علم سنبھالا تھا، اقبال مسلمانوں کو اس بار امانت کے اٹھانے کی دعوت دیتے اور انھیں بیدار و تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں

کبھی مشرق و مغرب کی تباہی کا واسطہ اور کبھی خدا کی قسم دیتے ہیں، اور کبھی یورپ کے پیدا کردہ عالمی بگاڑ، فساد اور انتشار کا حوالہ سامنے لاتے ہیں کہ اس نے دنیا کو بجائے امن و عافیت کے گہوارے کے فتنۂ و فساد، مصائب و آلام، ظلم و ستم، آہوں اور کراہوں کا جہنم بنا دیا ہے، جو زمین مسجد کی طرح پاک و مقدس مانی گئی تھی۔ اور جس میں خدا کے ذکر و فکر، تسبیح و تقدیس حمد و ثنا کی تعلیم دی گئی تھی، اسے فرنگ نے اپنی بد طینتی سے میخانہ اور قمار گاہ، درندوں کا بھٹ، فسق و فجور، اور چوروں لٹیروں کی پناہ گاہ بنا دیا اس لئے وقت آگیا ہے کہ بانیٔ بیت الحرام، اور حامل پیام اسلام پھر عالمی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور مغرب کے پیدا کردہ فساد کو صلاح سے، بگاڑ کو بناؤ سے اور تخریب کو تعمیر سے بدل دے اور قواعد ابراہیمی، اور سنت محمدی کے نقشہ کے مطابق دنیا کی تعمیر نو کرے، اقبال کا لافانی نغمہ اب بھی فضاؤں میں گونج رہا اور مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے:۔

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی   دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی   صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز   (از خواب گراں خیز!)

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ   فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ   معمارِ حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز!

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز   (از خواب گراں خیز!)



اقبال کا پیغام بلادِ عرب کے نام

اقبال نے اپنی منتخب نظموں میں سے ایک خاص نظم بلادِ عرب اور امتِ عربیہ کے لئے اپنی نیک خواہشات اور محسوسات کے اظہار کی خاطر لکھی ہے جس میں ان کے فضل و شرف، اسلام کی علمبرداری اور انسانیت کی دستگیری کا ذکر کیا ہے اور تاریخ کے اس عظیم اور تابناک صبح کی طرف اشارہ کیا ہے، جو انسانیت کی شبِ فراق و حرماں کی صبحِ وصال و سعادت بن گئی۔

بات سے بات نکلتے ہی اقبال اپنے محبوب خطۂ ارض میں پہنچ کر اپنی محبوب شخصیت کو یاد کرنے لگتے ہیں، جس کے ہاتھوں سے اس امت کی نشاۃ ثانیہ بلکہ انسانیت کی ترقی و نجات اور سعادت کی راہ کھلی۔

یہاں پہنچ کر وہ اپنی طبیعت کو بے روک ٹوک اور قید و بند کے اس کے فطری بہاؤ پر ڈال دیتے اور زمامِ کار و طاقت گفتار قلب و روح کے سپرد کر دیتے ہیں اور پھر گل افشانئ گفتار کا سماں بندھ جاتا ہے۔

آپ امتِ عربیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اے وہ امتِ عربیہ! جس کے بیابان و صحرا کے لئے بھی اللہ نے بقائے دوام مقدر کر دیا ہے، اے وہ عظیم قوم جس کی زبان سے تاریخ نے پہلی بار سنا کہ، قیصر و کسریٰ کا استبدادی نظام اب ختم ہوا[1]۔"

وہ کونسی قوم ہے جس کے نام پہلے پہل قرآن جیسا مقدس صحیفہ اترا؟ وہ کون سی جماعت ہے، جسے اللہ نے توحید کا رازدار بنایا اور جس نے معبودانِ باطل کی خدائی سے علانیہ انکار کر کے ان کی عظمت کا تختہ الٹ دیا۔ وہ کونسی سرزمین ہے، جہاں وہ شعلِ ہدایت روشن ہوئی جس سے عالم منور ہو گیا، کیا دنیا تمہارے سوا کسی اور کا نام لے سکتی ہے؟ علم و حکمت اور تمام فضائل اخلاق تمہاری دین ہیں، اور یہ سب ایک نبی اُمّی (فداہ ابی و امی) کا زندہ معجزہ ہے، جس نے اس صحرا کو چمن زار بنا دیا، جہاں حریت و مساوات کی ہوا چلی اور جہاں تہذیب نے آنکھیں کھولیں، جسم بشری بے قلب و روح تھا اسے دل و جان بخشے گئے ان کے فیض اثر سے اس کے روئے زیبا سے جہالت و جاہلیت کا گرد و غبار چھٹ گیا جس کے بعد وہ روشناس عالم ہوا۔

علوم و فنون زندہ ہوئے اور تہذیب و تمدن نے برگ و بار پیدا کئے، ان کے حلقہ بگوشوں میں وہ اولوالعزم فاتح، ابطال، اور قائدین پیدا ہوئے جنھوں نے حق و باطل کی جنگ میں حق و صداقت کو فیصلہ کن کامیابی عطا کی، انھوں نے دنیا کو وہ خداشناس مجاہد دیئے جو دن کو میدانِ جنگ کے شہسوار اور رات کی اندھیریوں میں عابد شب زندہ دار بن کر رہے جنھوں نے تلواروں کی چھاؤں میں اذانیں دیں اور عین معرکۂ حرب و ضرب

---

[1] یہ اس حدیث مشہور کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے، اذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ واذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ۔

میں نمازِ شوق ادا کی، بطلِ غیور صلاح الدین کی تلوار اور زاہد کامل بسطامیؒ کی نگاہِ تقویٰ پناہ ..... دنیا اور آخرت کے لئے شاہ کلید تھی۔

اس کے پیغام کی ہمہ گیری کے نیچے قلب و دماغ اور عقل و روح دونوں جمع ہو جاتے ہیں، رومیؒ کا ذکر اور رازی کا فکر اس کے سائے تلے بہم ہو جاتے ہیں علم و حکمت، دین و شریعت، بادشاہت اور حکومت سب اسی کا طفیل، اور الحمرا اور "تاج محل" اسی کا عطیہ اس کی بعثت کا تحفہ اور اس کی عبقری امت کا ہدیہ ہیں، یہ شاندار اسلامی تہذیب تو اس کے ذوقِ جمال کی ایک ظاہری جھلک ہے، اس کے باطنی حسن کا اندازہ تو عارفین و کاملین بھی نہیں لگا سکتے۔

وجود رحمۃ للعالمین سے پہلے انسان ایک مشتِ خاک سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا، ان کی بعثت نے ایمان و احسان اور علم و عرفان سے اسے آگاہ کیا۔

اے در ود دشتِ تو باقی تا ابد　　نعرۂ لاقیصر و کسریٰ کہ زد؟
رمزِ الا اللہ کرا آموختند　　ایں چراغ اول کجا افروختند
از دم سیراب آں امی لقب　　لالہ رست از ریگ صحرائے عرب
حریت پروردۂ آغوش اوست　　یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست
او دلے در پیکرِ آدم نہاد　　او نقاب از طلعتِ آدم کشاد!
سطوت بانگ صلوٰت اندر نبرد　　قرأت الصافات اندر نبرد!
تیغ ایوبی نگاہِ بایزیدؒ!　　گنجہائے ہر دو عالم را کلید!
عقل و دل را ستی از یک جامِ مے　　اختلاط ذکر و فکر روم و رے
علم و حکمت، شرع و دیں، نظم امور　　اندرونِ سینہ دل ہا ناصبور!

حسن عالم سوز احمر اد تاج آنکہ از قدسیاں گیرد خراج
ایں ہمہ یک لحظہ از اوقاتِ اوست یک تجلی از تجلیاتِ اوست
ظاہرش ایں جلوہ ہائے دل فروز باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز
(پس چہ باید کرد)

اقبال عربوں کے دورِ جاہلیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعثت محمدی سے پہلے عربوں کا کوئی نظام نہ تھا، اور وہ فوضویت اور انارکی کا شکار تھے، ان کی زندگی جانوروں کی زندگی تھی، اور کھانے پینے سے آگے ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد نہ تھا، ان کی تلوار چمکدار ضرور تھی، لیکن جوہر سے خالی اور کند تھی، وہ اسلام سے پہلے اونٹوں کو چراتے تھے، لیکن اسلام کے بعد دنیا کی جہاں بانی ان کے حصہ میں آگئی، اور ان کی تکبیر جہاد سے شرق و غرب گونج اٹھے۔

حق ترا برّاں تر از شمشیر کرد ساربان را راکب تقدیر کرد
کار خود را امتاں بردند پیش تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش!
امتے بودی امم گردیدۂ! بزم خود را خود زہم پاشیدۂ
ہر کہ از بندِ خودی وارست مُرد! ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مُرد

عربوں کی شجاعت اسلامی اور للّٰہیت کی مدح کے بعد انھیں یہ منظر غمناک کر دیتا ہے، جب وہ دیکھتے ہیں کہ عربوں میں اب نشاط کے بعد پھر جمود و بے حسی، وحدت کی جگہ تفرقہ، قیادت کے بجائے تقلید و پسماندگی پیدا ہو گئی ہے تو وہ انھیں دوستانہ عتاب کے ساتھ مخاطب کرتے اور کہتے ہیں "تمہارے جمود و خمود پر ایک عالم افسوس کر رہا ہے کہ دوسری قومیں کس طرح تم سے آگے نکل گئیں تم نے اپنے صحرا کی قدر نہیں کی اور اس کے پیغام کو بھلا دیا، تم پہلے ایک ملت ــــ ملت مسلمہ ــــ تھے،

لیکن آج ٹکڑیوں اور گروہوں میں بٹ گئے، پہلے حزب اللہ ہی تمہاری جماعت تھی، لیکن اب تمہاری جماعتیں بے شمار ہیں، عربوں کو معلوم نہیں کہ جو اپنی شخصیت اور حیثیت پر ظلم کرتا ہے، اور اعتماد نفس کھو دیتا ہے، وہ عالم وجود ہی سے مٹ جاتا ہے، اور جو اپنی چھاؤنی سے نکل کر دشمن کی پناہ ڈھونڈتا ہے، وہ ذلت و بدبختی اور محرومی و ناکامی کا منہ دیکھتا ہے، عربوں کا دشمن ان سے بڑھ کر اور کوئی نہیں انھوں نے خود اپنے ساتھ ناانصافی کی ہے، اور روحِ رسولؐ کو تکلیف دی ہے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی روح آج امت عربیہ سے شکوہ سنج اور گلہ گذار ہے:۔

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روحِ پاکِ مصطفےٰ آمد بدرد!

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر!

حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد
وحدت اعرابیاں صدپارہ کرد

تا عرب در حلقۂ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں او را نداد

شاعر افرنگ کے مکر و فریب اس کے خطرناک منصوبوں اور ارادوں کو خوب سمجھتا ہے، اس لئے کہ اسے اس نے قریب سے رہ کر دیکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ عربوں کو خوش گمانی میں مبتلا دیکھ کر قدرتی طور پر تکلیف محسوس کرتا ہے اور ان کی اس سادہ لوحی اور زود اعتمادی پر فریاد کرتا ہے کہ وہ انھیں اپنا نجات دہندہ اور مشکل کشا سمجھتے ہیں، وہ انھیں مخاطب کر کے کہتے ہیں" نادانو! عقل کے ناخن لو تم فرنگ پر اعتماد کر رہے ہو، لیکن اس کے پوشیدہ عزائم کی تمہیں خبر نہیں، تمہیں معلوم نہیں کہ سحر فرنگ نے کتنوں کو مردِ بیمار اور مجبور و گرفتار بنا کر رکھدیا ہے تمہیں نظر نہیں آتا کہ افرنگ نے تمہاری وحدت ختم کر کے بیسیوں حکومتیں بنا دیں اور جنگوں میں ان کا

کل سرمایہ لوٹ کر ایسا غارت کیا کہ کوئی غمخوار بھی نہیں ملا، اتنا کہنے کے بعد اقبال پھر اپنی فطری رجائیت سے کام لیتے ہوئے اور عربوں کو نشأۃ ثانیہ کے لئے ابھارتے ہوئے کہتے ہیں۔

"تمہیں خدا نے جو بصیرت دی ہے، اس سے کام لو اور دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنا دو، اپنے اندر عمر بن الخطابؓ کی روح پیدا کرو، اور اس راز کو سمجھ لو کہ قوت کا منبع دین وایمان ہی ہیں، جو مومن کا سرمایہ ہیں، اے صحرا نشینو! جب تک تمہارے دل اسرارِ الٰہیہ کے امین ہیں تمہیں دین کے نگہبان اور دنیا کے پاسبان ہو، تمہاری فطرت خیر وشر کی میزان ہے، اور تم روئے زمین کے وارث ازلی ہو جب تمہارا کوکبِ اقبال مطلعِ مشرق سے نمایاں ہوگا تو سحر روشنی ماند پڑ جائے گی"۔

عصرِ خود را بنگر اے صاحب نظر — در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ را
قوت از جمعیتِ دینِ مبیں — دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں
تا ضمیرش رازدانِ فطرت ست — مردِ صحرا پاسبانِ فطرت ست
سادہ طبعش عیارِ زشت و خوب — از طلوعش صد ہزار انجم غروب
عصرِ حاضر زادۂ ایامِ تست — مستیٔ او از مئے گلفامِ تست!
شارحِ اسرارِ او تو بودۂ، — اولیں معمارِ او تو بودۂ!
تا بہ فرزندی گرفت او را فرنگ — شاہدے گردید بے ناموس و ننگ
گرچہ شیریں ست و نوشین ست او — کج خرام و شوخ و بے دین ست او

مردِ صحرا پختہ تر کن خام را
بر عیارِ خود بزن ایام را!

صحرا کی فضائیں تمہارے لئے تنگ ہو سکتی ہیں لیکن اگر تم اپنی خودی کی تعمیر کرتے ہو تو تمہارے وجود کے آفاق بے کراں ہو جائیں گے، اور تم آندھی سے زیادہ تند اور سیلاب سے بڑھ کر تیز ہو جاؤ گے اور بازی گاہِ حیات میں تمہارا کوئی مقابل نہ ہوگا

اقبال حسرت سے پوچھتے ہیں، آخر کس نے تمہیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے کر دیا حالانکہ عصر حاضر تمہاری ہی محنتوں کا پھل اور تمہاری دعوت وجہاد کا نتیجہ ہے زمانے کی باگ جس دن سے تمہارے ہاتھوں سے نکل کر مغرب کے ہاتھوں میں آئی ہے اسی دن سے انسانیت نے اپنا وقار واعتبار شرف وعزت اور کرامت وافتخار کھو دیا ہے اور منافقت و دین بیزاری اس کا شعار بن گیا ہے۔

اے بادیہ نشیں! اور اے صحرا نورد!! اپنا مقام دیکھ اور رفتار زمانہ کو روک لے، تاریخ کا رُخ موڑ دے اور قافلۂ بشریت کی اس کے مقصدِ اعلیٰ اور منزلِ آخر کی طرف رہنمائی کر:

بگذر از دشت و در کوہ و دمن — خیمہ را اندر وجودِ خویش زن

طبع از باد بیاباں کردہ تیز — ناقہ را سر دہ بمیدانِ ستیز

دانش افرنگیاں تیغے بدوش — در ہلاک نوعِ انساں سخت کوش

رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست — آبروئے خاوراں در دستِ تست

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں — آں یدِ بیضا برآر از آستیں!

(پس چہ باید کرد)

اقبال روحِ رسول ؐ سے مخاطب ہوتے ہیں، اور امت کی پسماندگی اور زبوں حالی کا رونا روتے اور ایمان کی حرارت، زندگی کی حرکت کی نایابی پر آنسو بہاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام آج وطن میں اجنبی اور پردیسی بن کر رہ گیا ہے، وہ روحِ محمدؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں، آپ کی امت کا شیرازہ ابتر اور جمعیت برہم ہو گئی، یہ امتِ مرحوم ومحروم

اب کہاں جائے اور کیا کرے ۔۔۔؟ بحر عرب اپنی روانی اور طغیانی اور جوش و خروش کھو چکا ہے، اور عرب بھی اپنے سوز دروں سے خالی ہو چکے ہیں، اب میری تسکین و تسلی کی کیا سبیل ہو اور میرے رنج و الم کا مداوا کون کرے، زندگی کے طویل سفر میں آپ کی امت کا حدی خواں حیران و سراسیمہ ہے، لیکن مستقبل کی منزل دکھائی نہیں دیتی، اللہ آپ امت کے حال زار پر نگاہ کرم فرمائیں اور اس نازک گھڑی میں اس کے دست گیر ہوں۔

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں — پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد! — آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟

(اے روح محمد)

حساس شاعر کو یہ بات سخت ناگوار اور اس کی ناخوشی کا باعث ہے کہ عرب باوجود مسلسل تجربات کے مغربی طاقتوں کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھیں اور ان سے اپنے مسائل و مشکلات کا حل طلب کریں اور خصوصاً مسئلہ فلسطین کے منصفانہ حل کی امید رکھیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیں کہ مغربی طاقتوں پر یہودی بری طرح مسلط ہیں اور ان کی سیاسی، اقتصادی اور صحافتی مشنری یہود کے ہاتھ میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ جو شعلۂ حیات تاریخ میں کبھی بڑی تب و تاب سے سامنے آیا تھا، وہ آج بھی عربوں کے اندر موجود ہے، اور کسی وقت بھی بھڑک سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عربوں کی مشکلات کا حل لندن اور جنیوا میں نہیں بلکہ ان کی خودی کی تعمیر میں مضمر ہے، اخیر میں شاعر امرائے عرب سے اپنی جرأت گفتار کی معذرت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عربوں سے مجھے امید ہے کہ وہ اس عجمی کی تاب گفتار کو معاف کریں گے، اور

اس عجمی کی حدیث زیرلبی کو اپنے معاملات میں مداخلت نہ سمجھیں گے۔ اے اہلِ عرب! تم اس دین کے اولیں حقیقت شناس ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا قرب ابولہب سے انقطاع ہی پر منحصر ہے، اور ایمان و کفر ایک دوسرے کے مقابل ہیں، اسی طرح اسلام قومیت، وطنیت اور مادی فلسفوں سے بیزار اور الگ ہے، اور عالمِ عربی سرحدوں اور سرزمینوں کا نام نہیں بلکہ محمد عربی سے انتساب اور اس عربی تعلق کا دوسرا نام ہے"۔

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار — اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو — وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اسکا — محمدؐ عربی سے ہے، عالم عربی!

(امرائے عرب)



مسجد قرطبہ

۱۹۳۲ء میں جب اقبال نے مسلمانوں کے فردوسِ گم شدہ ــــ اندلس ــــ کی زیارت کی تو مسجد قرطبہ میں بھی حاضر ہوئے ــــ یہ حاضری آثار قدیمہ کے کسی شوقین سیاح کی نہ تھی، بلکہ ایک مردِ مومن اور دردمند وحساس شاعر کی آمد تھی، جو ایمان وعرفان کے اس پیکرِ جلیل ومظہرِ جمیل کے حضور میں تھی، یہ زیارت ایک عظیم مسلمان کی مسلمانوں کی ایک عظیم یادگار کے لئے تھی، اس کا مقصد اس میراث ایمانی پر آنسو بہانا تھا، جو عبدالرحمٰن الداخل اور اس کے ساتھیوں نے یہاں چھوڑی تھی۔

اقبال نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بیکراں جذبات، پاکیزہ محبت کے احساسات، فن تعمیر کی عبقریت، اسلامی آرٹ کا اعجاز اور اس کی کرامت، اس کی سادگی و پرکاری، جمال کی رعنائی اور حسن کی یکتائی کا بڑی بصیرت سے معاینہ کیا اس منظرِ عبرت اثر نے مومن شاعر کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دئے جس کے نتیجے میں وہ لافانی نغمہ دنیا نے سنا جسے ہم "مسجد قرطبہ" والی نظم میں گونجتا ہوا پاتے ہیں، اقبال نے

اس عظیم مسجد کو اسلام اور مسلمانوں کی تہذیبی علامت، اشارہ، اور رمز (SYMBOL) کی حیثیت سے دیکھا اس مسجد کے در و دیوار اور نقش و نگار میں انھیں مومن کے اخلاقِ حسنہ اور فضائل و شمائل، عالی ہمتی و بلند نظری، وسیع القلبی و عالی ظرفی، سادگی اور نیک مزاجی، بلند طبعی و بلند مشربی، اخلاص و للّٰہیت، حق پسندی و عزم و ثبات، جرأت و بے خوفی، اس کی تواضع اور خودداری اور اس کے جلال و جمال کی تصویر اور اس کا ایک جامع مرقع نظر آیا۔

انھیں مسجد دیکھ کر مسجد کے وہ بانی یاد آئے جن کے ذوقِ جمال، حسنِ طبیعت، فن کاری اور صناعی کا یہ مسجد مرصع آئینہ ہے، اور پھر ان کے افکار و پیغام کی یاد تازہ ہو گئی جس کے وہ حامل و امین اور داعی و مبلغ تھے، مسجد کے باعظمت و پرشوکت خوش شکل اور قوی ہیکل منارے دیکھ کر وہ اذانیں یاد آئیں جو کبھی یہاں کی فضاؤں کو مسحور کرتی تھیں اور جسے لوگ زندگی کے ہنگاموں کے اول و آخر میں ہر روز سنتے تھے، اذانیں اس امت کی انفرادی آواز ہیں، اور اس کے قومی ترانہ (NATIONAL ANTHEM) کی حیثیت رکھتی ہیں جن کی نظیر نقارخانۂ عالم کے کسی صوت و آہنگ، نغمۂ موسیقی، اعلانِ بیان اور طرزِ اظہار میں نہیں ملتی، اذان جس خطابِ عام اور پیغام پر مشتمل ہوتی ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی فلسفہ و پیام، اور مذہب و الہام میں نہیں مل سکتی، ان اذانوں سے کبھی قلبِ کائنات اور روحِ عالم کانپ اٹھتی تھی، اور ایوانِ باطل کے در و بام پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

یہی اسلامی اذان تھی، جس سے دنیا میں صبحِ صادق کا اجالا پھیلا اور چھٹی صدی مسیحی کی گھنگور فضائیں روشن ہو اٹھیں، انہی اذانوں کے طفیل روشنی کی وہ کرنیں

پھوٹیں جو تقدیرِ انسانی کے لئے پیام تجلی بن گئیں ——— اقبال نے ان اذانوں کے تصور میں اس آسمانی پیام اور روحانی ہدایت کو یاد کیا جسے وہ اذانیں آفاقِ عالم تک پہنچاتی تھیں، انھیں اس کے وہ بلیغ معانی یاد آئے جو ان اذانوں کا مطلب و مفہوم ہیں، اور اس تصور سے ان کا یہ عقیدہ اور پختہ ہوا کہ جو قوم اس پیام کی حامل اور اس آفاقی، اور ابدی دعوت پر عامل ہوگی وہ بھی اس نظریۂ حیات کی طرح لازوال اور غیر فانی ہے۔

اس حسین لیکن عبرت انگیز و حسرت خیز منظر، تاریخ کی اس یادگار و شاہکار، اور اس عظیم مسجد نے (جس کا منبر خطبوں سے جس کے صحن و محراب سجدوں سے اور جس کے منارے اذانوں سے صدیوں سے محروم چلے آرہے تھے) اقبال کے دل کا ایک ایک تار چھیڑ دیا اور ان کے غیر مندمل زخموں کو کرید کر اور ہرا کر دیا، ان کے احساسات کے سمندر میں ایمان و عرفان، ذوق و شوق، نغمات و الحان، کے ساتھ ہی آلام و احزان کی موجیں اٹھنے اور لہریں بیدار ہونے لگیں، اور اس پس منظر میں ان کی عظیم نظم "مسجد قرطبہ" تیار ہوئی جس کا اکثر حصہ قرطبہ میں لکھا گیا، اور سرزمین اندلس ہی میں تمام ہوئی۔

اقبال نے اس میں فن و زندگی کے بہت سے نظریات و اقدار سے پردے ہٹائے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یہ زوال پذیر دنیا فانی ہے، اور اس کے ساتھ ہی قوموں کی عظیم یادگار اور آثار، اور انسانی عبقریت کے نقش و نگار اور اس کے شاہکار سب منزل فنا اور عالم بے نشانی و گمنامی کی طرف رواں ہیں، لیکن اس رسم عام سے وہ آثار اور تعمیرات مستثنیٰ ہوتی ہیں جنھیں کسی بندۂ باخدا، عبدِ مخلص، اور مردِ مومن کا دستِ مسیحا اور پنجۂ اعجاز نما چھو جاتا ہے، اور وہ اپنے ایمان و زندگی، اپنے مومنانہ جذبات اور

اپنی بقائے دوام کے اثر سے ان میں جان ڈال دیتا اور لافانی بنا دیتا ہے، اپنے عشق و محبت[1] کی قوت و تاثیر سے انھیں زندگی جاوداں عطا کرتا ہے۔

اقبال کی نگاہ میں محبت اصلِ حیات ہے جس پر موت حرام ہے، زمانہ کا سیلِ رواں بہت تند و سبک خرام اور تیز گام ہے جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی، لیکن عشق و محبت اس کے مقابلے پر آ کھڑے ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ خود بھی سیلاب ہیں، اور سیلاب ہی سیلاب کو تھام سکتا ہے، محبت زمان و مکان کی قیود و رسوم سے بلند ہی نہیں، بلکہ اس کے امکانات و مضمرات انسانی عقل سے بہت زیادہ ہیں اور اس میں ایسے آنات و ساعات اور زمان و اوقات ہیں، جن کا کوئی نام و نشان بھی نہیں جانتا، محبت کی تجلی، آسمانی رسالتوں، اخلاقی اور نبوی تصورات سب میں مشترک ہے۔

محبت ہی سے تصویر کائنات میں رنگ و نور اور مرقع عالم میں فرح و سرور کی نمود ہے، محبت ہی وہ شراب طہور ہے، جس سے سرشار ہو کر عارف سرمست اور عاشق نغمہ سرا ہو اٹھتے ہیں، محبت کبھی منبر و محراب کی نقیب، کبھی حکیم نکتہ داں، کبھی قائد جنگ و جہاد اور کبھی فاتح اقوام و امم بن کر سامنے آتی ہے، محبت کے ہزاروں رنگ و آہنگ ہیں، محبت ازل کی مسافر ہے، اس کا مذہب کوچ اور سفر اور سیر و سیاحت ہے، اور وہ ہر منزل کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے، محبت ہی زندگی کی بانسری ہے، جس سے نغمہ و آہنگ نکل نکل کر عالم کو مسحور و مخمور کئے ہوئے ہیں، محبت ہی سے دنیا میں

---

[1] اقبال کا عشق، مادہ سے بالکل الگ اور نفسانی شائبہ سے تمام تر پاک اور ایمان و شوق اور صالح جذبات کا نام ہے۔

روشنی وگرمی، حرکت وحرارت، اور زندگی کی امنگ اور ترنگ ہے:۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات — سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات!
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار — موت ہے تیری برات موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات!
اول و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا — نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا!
ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات و دوام — جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام!
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود — عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات — عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات!

اس طویل تمہید کے بعد اقبال مسجد قرطبہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے خطاب کرتے اور کہتے ہیں "اے مسجد عظیم! تو اپنے وجود و نمود میں اس پاک محبت، اور ان شدید جذبات

اور پرشوق احساسات کی رہین منت ہے جو ابدی اور دائمی ہیں، اس لئے تو بھی دوامی اور لازوال ہے۔

جو فلسفہ خونِ جگر سے نہیں لکھا جاتا اور جس آرٹ اور فن میں فنکار کا خونِ دل شامل نہیں ہوتا اور جس شاہکار کے لئے ادیب و مصور کا موئے قلم روح کی روشنائی میں نہیں ڈوبا ہوتا وہ سطحی مصنوعی، اور لفظ و صوت، رنگ و روغن اور کنکر پتھر کا ایک خالی خولی ڈھانچہ ہوتا ہے، جس میں نہ جان ہوتی ہے، نہ زندگی کی تازگی و رعنائی، فنی شاہکار گہری محبت، جذبہ کی گرمی اور خلوص کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، محبت ہی پتھر کے مجسمہ اور زندہ انسان میں فرق و امتیاز پیدا کرتی ہے، اور محبت کا جب کوئی قطرۂ حیات پتھر پر گر جاتا ہے تو وہ بھی دل کی طرح دھڑکنے اور زندگی کا ثبوت دینے لگتا ہے، اور جب اس سے انسانی دل بھی خالی ہوتا ہے تو وہ دل، دل نہیں پتھر کی سل سمجھا جاتا ہے، اقبال اثنائے خطاب میں مومن کی عظمت اور اپنی شخصیت کے بارے میں تعارفی انداز میں گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں ——— "اے مسجد عظیم! ایمان اور ذوق و شوق کی یکسانی اور جذبات کی اطاعت ہم دونوں کا مسلک ہے، اور میرے تیرے درمیان ایک ربطِ نہاں موجود ہے، انسان اپنی خلقت میں اگرچہ مشتِ خاک ہے، لیکن اس کا دل رشکِ عرش و افلاک ہے، انسانی دل بھی اشراق نوری اور لذتِ حضوری سے سرشار رہتا ہے، ملائکہ دائمی سجدے کے لئے یقیناً مشہور ہیں، لیکن انسانی سجدے کی لذت و حرارت ان کے نصیب میں کہاں۔؟

اقبال اپنی برہمنیت اور ہندستانیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کافر ہندی کا یہ ذوق و شوق اور اس کی قلب ماہیت دیکھ کہ گہوارۂ کفر میں نشو و نما

پاکر کبھی لب پہ صلاۃ ودرود، اور دل میں تحیہ وسلام کی صدائیں گونج رہی ہیں، اور میں عالم مسافرت میں تجھ جیسے غریب الوطن سے مل کر سراپا شوق بن گیا ہوں تیری فطرت اور میری طبیعت میں پوری یک رنگی اور ہم آہنگی موجود ہے:-

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل! — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز — تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں — گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود!
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق — دل میں صلاۃ و درود لب پہ صلاۃ و درود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے — نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے!

اس معجزۂ فن کو دیکھ کر انھیں وہ مردِ مومن و کامل، اور مثالی انسان (IDEAE MAN) یاد آجاتا ہے، جسے اسلام پیدا کرتا ہے، اور جو اس کے معاشرہ کا ایک فرد ہوتا ہے، ساتھ ہی وہ عظیم امت ان کے متخیلہ میں ابھرتی ہے جس سے ان جیسی مسجدوں کی رونق ہے۔

اقبال کی نظر میں یہ وقیع و رفیع مسجد اپنی مجموعی تصویر و تاثیر میں مومن کی تعبیر اور اس کے معنوں کی مادی تفسیر ہے، جلال و جمال، پختگی اور مضبوطی، وسعت و رفعت اور اپنی دلآویزی و رعنائی میں مسلمان کی ہو بہو شبیہ (TRUE COPY) مسجد کے بلند و بالا ستونوں کی ہیئت سے انھیں صحرائے عرب کے وہ نخلستان یاد آتے ہیں، جو اپنی کثرت و رفعت میں اس کی مثال ہیں وہ اس کی جالیوں اور جھروکوں میں ایک

ربّانی نور اور ایک خدائی روشنی کا ظہور دیکھتے اور اس کے بلند میناروں کو رحمت الٰہی کا مہبط اور فرشتوں کی فرودگاہ سمجھتے ہیں، اور ایمان و یقین کے جذبے سے سرشار ہو کر فرماتے ہیں کہ مسلمان بھی زندہ و جاوداں، لافانی اور لازوال ہے، اس لئے کہ وہ ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور تمام انبیاء کے اس لافانی پیغام کا حامل و امین ہے جسے اللہ نے بقائے دوام اور ابدی استحکام عطا کیا ہے، اور یہ امت دنیا میں جس کی داعی و نقیب ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ مسجد ملتِ اسلامیہ کے افکار و خیالات، اس کے عزائم اور معتقدات کی ایک تجلی ہونے کی وجہ سے اس کی نمائندہ ہے، جس طرح یہ ملت ملک و وطن، نسل و قومیت کے غیر حقیقی اور محدود تصورات سے بری ہے، اسی طرح یہ مسجد بھی عرب عجم کے حسین امتزاج، اور آفاقی میل ملاپ کا نمونہ ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مومن کا وطن، زمینی حدود سے بے نیاز اور اس کے آفاق بے کراں ہیں، اور اس کے پیغام کا سوز و ساز مشرق و مغرب دونوں کو محیط ہے، عراق کے دجلۂ و فرات، ہندوستان کے گنگ و جمن، یورپ کے ڈینوب و بحرِ روم اور مصر کا دریائے نیل اس کے بحرِ بیکراں، اور محیط اعظم کی ایک موج خوش خرام ہیں، تاریخ میں اس کے شاندار اور عظیم الشان کارناموں اور فتح و ظفر کی داستانوں کی مثالیں نایاب ہیں، اسی امت نے عصرِ کہن کو اذنِ رخصت دے کر دورِ جدید کا آغاز اور عہدِ نو کا افتتاح کیا۔

اس امت کے افراد محبت و انسانیت کے نمائندے اور امام، اور ایمان و اخوت کے سچے نمونے اور مثال ہیں، مومن کی زبان ابرِ گوہر بار اور اس کے سیف و سنان جوہر دار ہیں، وہ دل کا غنی، اور تلوار کا دھنی ہے، وہ میدانِ جنگ اور تلواروں کی چھاؤں میں بھی توحید و رسالت اور ایمان و توکل کا پیامبر اور خدا طلبی کی راہ میں

گرم سفر رہتا ہے، حق و باطل کے معرکے میں قوتِ ایمانی اس کا اوزار اور خدا پر اعتماد اس کا ہتھیار ہوتا ہے، وہ کس والہانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں کہتے ہیں:۔

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار — شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور — تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے — اسکی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل
اسکی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور — اسکے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اسکے زمانے عجیب اسکے فسانے غریب — عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیِ اربابِ ذوق فارسِ میدانِ شوق — بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اسکی اصیل
مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ — سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

پھر مسجد قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو دنیا میں مومن کے خواب کی تعبیر اور اس کی اولوالعزمیوں کی تشریح و تفسیر ہے، اور خشت و سنگ اور تعمیری رنگ و آہنگ میں مومن کی روح کا ظہور، تو اپنے وجود میں سرِّ مومن کا افشائے راز، اور اس کے لیل و نہار کا سوز و گداز ہے اور تیرے پیکرِ جمیل سے اس کے بلند احوال و مقامات اور ارجمند افکار و خیالات کی چہرہ کشائی ہو رہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ[1] مومن کا ہاتھ اپنی کارکشائی اور کارسازی، اپنی مشکل کشائی اور تازہ کاری، فتح و ظفر، قوت و سطوت، اور غلبہ و اقتدار کے لئے دنیا میں خدا کا ہاتھ اور قدرتِ الٰہی کا ایک ذریعہ ہے۔

مومن بظاہر خاکی لیکن دراصل نوری ہے، اس کی ذات میں اخلاقِ الٰہیہ اور

۱؎ ایک حدیث قدسی بھی اس معنی کی احادیث کے ذخیرے میں ملتی ہے (مترجم)

صفاتِ عالیہ کا پرتو اور اس کا عکس جمیل ہے، اس لئے وہ دنیا سے مستغنی اور مادیت سے بے نیاز ہے' اس کی امیدیں اور آرزوئیں' اس کی خواہشات اور تمنائیں بہت معصوم سادی اور قلیل' لیکن اس کے مقاصد و نصب العین اس کے اغراض اور پروگرام اس کا عزم و حوصلہ' اس کی ہمت اور اس کا ولولہ بہت عظیم و جلیل ہیں، وہ بیک وقت جلال و جمال، محبت و ہیبت کا جامع اور نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو کی مثال ہے، صلح و امن میں حریر و پرنیاں اور حرب و ضرب میں شمشیر و سناں! وہ صلح و جنگ ہر حال میں معصوم اور پاکیزہ شخصیت کا مالک ہے۔

اس کا ایمان وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد دائرۂ عالم گھومتا ہے، اس کی ذات کائنات کی اصل و حقیقت اور اس کے سوا سب طلسم و مجاز، اور وہم و گماں ہے، وہ عقل و فکر کی غایت اور ایمان و محبت کی نہایت ہے، اس کے وجود سے کائنات میں خوشنمائی و رعنائی اور زندگی میں قوت و بہجت کا اجتماع ہے، وہ عشق کی منزل محبت کا حاصل، اور جسم وجود کا دل ہے:۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اسکے دلوں کی تپش اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند' اس کا خیال عظیم — اس کا سرور اسکا شوق اسکا نیاز اسکا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اسکا دل بے نیاز
اسکی امیدیں قلیل، اسکے مقاصد جلیل — اسکی ادا دلفریب اسکی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین — اور یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز!

عشق کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ　　　حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

وہ دوبارہ مسجد قرطبہ سے مخاطب ہوتے اور کہتے ہیں کہ تو اربابِ فن کا کعبہ، نیازمندانِ عشق کا قبلہ اور اسلامی عظمت کا نشان ہے تیری وجہ سے اہل نظر کی نظر میں سرزمین قرطبہ فلک منزلت اور حرم مرتبت ہوئی، تیری رعنائی و برنائی، دلکشی اور دل کشائی کی اگر کوئی مثال مل سکتی ہے تو صرف قلبِ مسلم اور دل مومن میں ——— اقبال یہاں پہنچ کر بے اختیار ہو جاتے ہیں، اور ماضی کی طرف والہانہ دیکھتے ہیں اور تخیل کے پروں سے اڑ کر صدیوں کی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلامی دور کے اندلس میں پہنچ جاتے ہیں، اور رومانویت و کلاسکیت کو فکر و فن کا جامہ پہناتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ وہ مردانِ خدا، اور اربابِ صفا خلق عظیم و لطف عمیم کے جامع اور صداقت و اسلامیت کے حامل عربی شہسوار کہاں گئے، اور ان کا قافلۂ سخت جاں، عشق شور انگیز کی کس منزل میں ہے؟ وہ عرب خلفا اور حکمراں کہاں گئے، جن کی حکومت، خدمتِ انسانیت کا دوسرا نام اور جنکی بادشاہی و جہانگیری رفاہِ عام و فلاحِ عوام تھی، جو مشرق و مغرب کے مربّی اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بانی تھے اور جن کی بصیرت کی روشنی یورپ کے قرونِ مظلمہ (DARK AGES) کے لئے روشنی کا مینار کا حکم رکھتی تھی، اور جن کا وجود یورپ کے لئے پیام رحمت بنا ہوا تھا۔

اقبال کہتے ہیں، اسپین میں باوجود مغربیت کے عربی خون کی لالکاری اس کی چمن بندی میں مصروف ہے، اور اندلسیوں میں آج بھی عربوں کے اثر سے روح کی لطافت و خوشدلی، مہماں نوازی و گرمجوشی، سادگی اور مشرقیت کا جمال باقی ہے، خوشبوے نجد و یمن سے آج بھی اسکی ہوائیں معطر، اور فضائیں معنبر ہیں، اور آہنگ حجاز و عراق کی صدائے بازگشت

وہاں اب بھی سنی جاسکتی ہے:—

کعبۂ اربابِ فن سطوتِ دینِ مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار — حاملِ خلقِ عظیم، صاحبِ صدق و یقیں
جنکی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب — سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جنکی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب — ظلمتِ یورپ میں تھی جنکی خرد راہ بیں
جنکے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی — خوشدل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال — اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں
بوئے یمن آج بھی اسکی ہواؤں میں ہے — رنگِ حجاز آج بھی اسکی نواؤں میں ہے

ماضی کی ان حسرتناک یادوں کے بعد وہ انقلاب کی تمنا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اندلس کی سرزمیں ہمدوشِ فلک ہوتے ہوئے بھی صدیوں سے اذانوں سے محروم چلی آرہی ہے اور باوجود اس کے کہ عالم میں انقلاب کی ہوا چل رہی ہے، یہاں صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی! جرمنی میں لوتھر کی تحریک تجدید و اصلاح REFORMATION کا ظہور ہوا جس نے تہذیب و ثقافت اور علم و ادب دونوں کو متاثر کیا اور پوپ کی عصمت اور کلیسا کی وہ عظمت دلوں میں نہیں باقی رہ گئی، آزاد خیالی کی رو نے فکر و فلسفہ کو تقلیدی بندھنوں سے آزاد کر دیا، یورپ میں نشاۃ ثانیہ RENAISSANCE کی تحریک نے ہر طرف نئی زندگی کی لہر دوڑا دی، روسو اور والٹیر کے زیر اثر انقلاب فرانس نے صنعتی دور کو جنم دیا، اور قدامت پرست روما بھی انقلاب کے لئے تیار ہو گیا۔[۱]

---

[۱] یہ نظم دوسری جنگ عظیم سے پہلے کہی گئی تھی جب مسولینی نے اہل اطالیہ میں قومی فخر و نخوت کی روح پھونک دی تھی، اور اٹلی فاشزم کی راہ پر چل پڑا تھا۔

اس پس منظر میں اقبال اسلامی انقلاب کی تمنا کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی انقلاب کی روح بے چین ہے لیکن کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ وہ بڑے رومانی انداز میں قرطبہ کی نہرِ وادی الکبیر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرے کنارے کوئی نظرِ ابدی ماضی کے آئینے میں مستقبل کو دیکھ رہا ہے، اور آنے والے زمانے کا تصور اتنا حیرت زا ہے اور یورپ کے لئے اتنا ناگوار کہ یورپ میری صاف گوئی اور دور اندیشی کو صبر و سکون کے ساتھ نہیں سن سکتا، پھر وہ اپنا نظریۂ حیات واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انقلاب تجدید اور خیر و شر کی کشمکش سے قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ ہوتا رہتا ہے، کارگاہِ حیات میں جو قومیں پھونک پھونک کر قدم رکھتی اور اپنے ہر نفس کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں، وہ زندگی کی مستحق قرار پاتی ہیں، اور دنیا میں ان کا وجود فیصلہ کن طاقت بن جاتا ہے آخر میں شعر و ادب اور فکر و فن کے بارے میں اپنی منفرد رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو فلسفہ خونِ جگر سے نہیں لکھا جاتا اور جو صرف دماغ سوزی کی پیداوار ہوتا ہے، اس میں زندگی نہیں ہوتی، اور ہر وہ فنی شہ پارہ فنا پذیر اور سریع الزوال ہے جس میں فن کار کا خونِ دل شامل نہیں اور وہ نغمہ جاوداں نہیں بن سکتا جس میں نے نواز کا سوزِ دروں اور دل کی آنچ نہیں، جو دل کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتا ——— یہ نظریۂ فن نہیں بلکہ نظریۂ حیات بھی ہے، ادب و زندگی دونوں کے لئے خونِ دل و جگر ہمیشہ ضروری رہا ہے :-

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے — عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دین — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

(بالِ جبریل)

نظم پر ایک عمومی تبصرہ[1]

اگر اقبال کی چند منتخب اور نمائندہ نظموں کا نام لیا جائے تو مسجد قرطبہ ان میں سے ایک اور سر فہرست ہوگی، اور شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اقبال کے فن و شخصیت، اور ان کے مجموعی ورثے میں یہ نظم ان کے واحد شاہکار کا حکم رکھتی ہے اور اردو ادب کے ناقدین کا متفقہ فیصلہ بھی اسی خیال کے حق میں ہے، نظم کے مختلف حصوں میں شاعر بڑے حسنِ ترتیب کے ساتھ اپنے خیالات کو سامنے لایا ہے، پوری نظم تبدریج اپنی انتہا اور ارتقا کو پہنچتی ہے

---

[1] از مترجم

اور بیچ بیچ میں اگرچہ جملہ معترضہ اور مختلف موڑ (CLIMEXES) بھی آتے رہتے ہیں لیکن ان کی حیثیت سنگ میل اور نقش و نگار راہ گزر ہی کی ہے، اور وحدت واثر اور مجموعی تاثر کے لحاظ سے یہ نظم بھی ہے، اور مختلف سلسلۂ ہائے خیال اور حلقہ ہائے فکر کی یکجائی کے اعتبار سے غزلوں کا مجموعہ بھی (اور ایسا اقبال کی تمام نظموں میں ہوا ہے کہ ان کی نظم کئی غزلوں کا مجموعہ ہوتی ہے) سب سے پہلے نظم کے تدریجی ارتقا اور فطری دروبست اور ترتیب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جذبات و خیالات کی ابتدا، عروج اور خاتمہ اور ان کے درمیانی اتار چڑھاؤ کو اپنی طبعی حالت پر برقرار رکھا ہے اور فکر کو جذبے سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے نظم کی تمہید سلسلۂ روز شب پر ایک فلسفیانہ نظر اور تاریخ کے واضح شعور کے پس منظر میں شروع ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عشق و ایمان کی قوت کائنات کی استثنائی طاقت ہے جس پر زوال و فنا نہیں عشق و ایمان وہ پارس پتھر ہیں، جو مٹی کو سونا اور یہ آب حیات فانی کو غیر فانی بنا دیتا ہے، اقبال نے تاریخ فلسفہ میں شاید پہلی بار اتنی وضاحت اور یقین کے ساتھ فلسفۂ تاریخ کے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ مرد خدا کا عمل (رنگ ثبات و دوام لئے ہوتا ہے اور اس کا عمل عشق سے صاحب فروغ ہوتا ہے) یعنی عالمی سچائیوں اور عالمگیر اقدار و حقائق کی طرح ایمان و یقین اور عشق و محبت کے انسانی جذبات بھی لافانی ہوتے ہیں اور کسی عمل میں ان کے سبب رنگ دوام پیدا ہو جاتا ہے اب فلسفہ سائنس میں بھی یہ نظریہ مسلمہ بن گیا ہے کہ اصل حیات اور اساس وجود ذہن (MIND) ہے نہ کہ مادہ (MATTER) یعنی معنوی اقدار ہی کائنات میں فیصلہ کن ہستی رکھتی ہیں ذہن و خیال اور جذبۂ و فکر ہی حقیقی وجود رکھتے ہیں اور مادی نقوش صرف اس کا ظہور ہیں، اقبال بھی فلسفہ کے

اسی روحانی مکتب فکر کے حامی تھے ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسجد قرطبہ کے خشت و سنگ فنا پذیر ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا معنوی وجود اس کا پیغام اور اس کے پیچھے چھپا ہوا جذبہ و ایمان، اس کے معماروں اور بانیوں کا عشق و خلوص زندہ جاوید ہے، مسجد قرطبہ زمانے کے حوادث کا شکار ہو سکتی ہے، اور اس کا ظاہری وجود مٹ سکتا ہے، لیکن تاریخ انسانیت میں اس کا نام انمٹ ہے اور جریدۂ عالم پر اس کے لئے بقائے دوام کی مہر ثبت ہو چکی ہے، اقبال کا کہنا ہے کہ چیزوں کی قدر و قیمت کمیت (QUANTITY) میں نہیں بلکہ کیفیت (QUALITY) میں ہے اور فانی سے فانی چیز ابدی حقائق سے مل کر لافانی بن جاتی ہے، مسجد قرطبہ کے ان معنوی اسباب دوام کے ذکر کے ساتھ مرد مومن کی باطنی صفات اور ذاتی خصوصیات کا تذکرہ ناگزیر اور فطری تھا، چنانچہ اقبال نے اپنے مرد مومن اور انسانِ کامل کا پورا تعارف کرایا اس کے ایمان و خلوص اور روحانیت و محبت اور جلال و جمال کی تصویر کشی کی اور اپنے فلسفہ خودی کے بنیادی نکات کو ایمانی صفات کا رنگ دیدیا اور پھر تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے مستقبل تک پہنچ گئے اقبال کا اس نظم میں سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ موضوع اگرچہ یاس انگیز و حسرت خیز اور یکسر قنوطی تھا، لیکن اقبال نے اسے پورے طور پر رجائی انداز سے ٹچ (TOUCH) کیا ہے، اور ان کا طرز استدلال APPROACH مکمل طور سے خوش آئند و بشارت آمیز ہے، نظم کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آفاق اور اس کا دائرۂ تخیل بہت ہمہ گیر اور محیط اور اس کا (CANVAS) بہت وسیع اور اس کے پس منظر کا تاریخی شعور بہت طویل و عریض ہے، اور تقریباً فتح اندلس سے لیکر زمانۂ حال تک کے تاریخی حوادث و انقلاب اور فکر و فلسفہ کے اہم تحریکات کا ذکر آگیا ہے، اس کے

ساتھ ہی اقبال کا نظریۂ حیات و کائنات، ان کا فلسفۂ خودی مردِ مومن کا تخیل، ایمان و عشق کے بارے میں واضح تصورات، ان کا فلسفۂ تاریخ، ان کا نظریۂ شعر و ادب فنونِ لطیفہ کے بارے میں ان کا طرزِ عمل زندگی کے تخلیقی و تحریکی عناصر اور ان کے علاوہ بہت سے واضح نظریات اس نظم میں آگئے ہیں، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کے آئینے میں ہم اقبال کی ہشت پہلو شخصیت کے خط و خال دیکھ سکتے ہیں، اور ان سے مل سکتے ہیں!



ذوق وشوق

سنہ ۱۹۳۱ء م ۱۳۵۰ھ کی ایک حسین صبح تھی، جب موتمر اسلامی کا قافلہ بیت المقدس کی مبارک و منور فضاؤں میں داخل ہوا، تمام ماحول کیف آور اور روح پرور تھی، آفتاب جہاں تاب کی سنہری کرنیں اس طرح ابھر رہی تھیں جیسے وہ نور کے چشمہ سے نکلی ہوئی نہریں ہیں، طلوع آفتاب کا منظر اور صبح کا سہانا سماں ہمیشہ سے شعرا کے لئے ذوق پرور اور نشاط وانبساط کا باعث رہا ہے، جس سے وہ قلب و نظر کی زندگی اور فکر و خیال کی تر و تازگی کا سامان پاتے رہے ہیں۔

مکان و زمان کے حسن و جمال نے ہمارے عظیم شاعر و فلسفی ڈاکٹر محمد اقبال کو (جو لیب سے اسلامی ہند کی طرف سے مؤتمر میں نمائندگی کرنے آرہے تھے) بہت متاثر و مسحور کیا انھوں نے بڑے انہماک اور غور سے ان دلفریب و دلکشا مناظر کو دیکھا اور دامِ نظر کو اس ارضِ رنگ و بو کی گلچینی کے لئے پھیلا دیا، متاع نگاہ کو دل کی راہ میں لٹا کر قلب و روح کی تسکین و تسلی کا سر و سامان کیا۔

اقبال کے لئے سرزمین فلسطین پر رنگ برنگ کے اڑتے ہوئے بادل، وہاں کے سبز پوش پہاڑ، وہاں کے سرو سمن، نسیم صبح کی خوشخرامی، رات کی بارش سے دھلے ہوئے برگ نخیل اور وہ ریگ رواں جو نرمی میں حریر و پرنیاں ہو یقیناً دلچسپی کا باعث ہوئی ہوگی، ان کی نگاہوں کے سامنے عربوں کی سادہ زندگی کے مناظر، بجھی ہوئی آگ، خیمے کی ٹوٹی ہوئی رسیاں، اور اکھڑے ہوئے خیموں اور جھولداریوں کا نشان، گذرے ہوئے کاروان کی خبر دے رہے تھے، وہ اس حسن فطرت اور اس جنت ارضی سے اسقدر خوش ہوئے کہ وہیں طرح اقامت ڈالنے کی خواہش کی، پیغمبروں کی اس سرزمین کے مناظر نے (جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتے آئے ہیں) اس موقع پر بھی شاعر کے سوئے ہوئے جذبات اور ناآسودہ آرزوؤں اور تمناؤں کو ایک بار پھر جگا دیا اور احساس کی شدت نے اسلام اور مسلمانوں کی محبت کو صوت و نغمہ کا آہنگ بخشدیا اور یہ دل سے لگا ہوا محبوب موضوع ان کے احساسات کی فضا پر چھا گیا اور ان کی توجہات و میلانات کا واحد مرکز بن گیا، اور ان کو وہی صورت حال پیش آئی جو عرب شاعر کے سامنے آئی تھی اور اس نے کہا تھا۔

ولما نزلنا منزلاً طلہ الندی انیقاً وبستاناً من النور حالیا

اجدّ لنا طیب المکان وحسنہ منی فتمنینا، فکنت الامانیا

(جب ہم شبنم سے شاداب مقام اور گل و غنچہ سے مہکے ہوئے باغ میں اترے تو حسن مقام نے ہمارے دل میں چند آرزوئیں پیدا کر دیں اور ان آرزوؤں کی جان تمہیں تھے)

وہاں ان میں وہ بلند خیالات و احساسات پیدا ہوئے جو زمان و مکان کی حدود سے پرے اور حد درجہ غیر معمولی تھے، انھوں نے اندازہ کیا کہ یہ عالم پیران کے تازہ دم اسلامی جذبات و خیالات کی تاب نہیں لا سکتا، اور اس کا جامد اور تقلیدی ذہن آئے دن

قومیت و وطنیت، جنس و جغرافیہ اور رنگ و نسل کے بت تراشتا اور پوجتا رہتا ہے، اور خواہشات و نفسانیت کے لئے حیلے تلاش کرتا رہتا اور انھیں تقدس کا رنگ دیتا ہے یہاں انھیں اس دورِ جدید کا ابراہیم یاد آتا ہے، جو اٹھے اور اٹھ کر دنیا کو ان اصنام خیالی سے پاک اور خالی کر دے۔

اس موقع پر وہ عالم اسلام کو دیکھتے ہیں تو وہاں ظاہری افلاس و پسماندگی کے ساتھ ہی عقل و شعور اور فکر و وجدان کا فقدان اور ذہنی افلاس نظر آتا ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ عالم عربی بھی ایمان و عقیدہ کی پختگی، اور روح و جذبہ کی برشتگی کھو چکا ہے اور عرب کے ساتھ عجم بھی جدّتِ افکار سے محروم ہو چکا ہے، اور موجودہ مادی نظام بھی کسی انقلابی مردِ خدا کے انتظار میں ہے، جو حق و صداقت کا عالمی رول ادا کرے اور حالات کو یکسر بدل دے اور حسینؓ بن علیؓ کا حق پسندانہ کردار ایک بار پھر تازہ کر دے، عالم اسلامی اس انقلاب کے لئے عالم عربی کی طرف توقع کی نظریں اٹھائے ہوئے ہے، اور دنیا گہوارۂ اسلام —— حجاز —— کی طرف حسرت سے دیکھ رہی ہے لیکن اس کی دستگیری کے لئے کوئی ہاتھ نہیں بڑھتا اور ساحل دجلہ و فرات پر کوئی کربلائے حق نہیں ظاہر ہوتا، انسانیت کی پکار پر کسی طرف سے لبیک کی صدا نہیں آتی اور عالم اسلامی میں کوئی مردِ خدا نہیں دکھائی دیتا۔

یہاں پہنچ کر اقبال اس جمود و انحطاط کا سبب عالم اسلام کی دینی غیرت اور ایمانی جوش و محبت کی کمی کو قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ عقل و دل و نگاہ ہر چیز کو محبت کا خادم اور عشق کا مصاحب و ملازم ہونا چاہئے اور دین کی بنیادوں کو ایمان و محبت کے عناصر سے مضبوط کیا جائے جب تک دین کے ساتھ مسلمانوں کا جذباتی لگاؤ اور

ان کے عشق و محبت کا جھکاؤ نہیں ہوتا دین صرف مظاہر و رسوم اور بے جان احکام کے مجموعے کا نام رہے گا جو زندگی کی توانائی اور اس کی رعنائی و برنائی سے خالی اور اثر و نفوذ سے عاری ہوتا ہے۔

اقبال کی نگاہ میں معجزات و خوارق کا ظہور عشق ہی کے ہاتھوں ہوتا ہے، عشق کبھی صدق خلیلؑ ہے، کبھی صبر حسینؓ اور کبھی غازی بدر و حنین!

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں — چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود — دل کیلئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب — کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگ نخیل دھل گئے — ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر — کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کے لئے عیش دوام ہے یہی!

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات — کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات!
ذکر عرب کے سوز میں فکر عجم کے ساز میں — نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات!
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

پھر شاعر اپنے انسان کامل اور مردِ مومن کی طرف متوجہ ہوتا اور اسے خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا وجود کائناتی وجود کی غایتِ اولیٰ ہے تو ہی رازِ کن فیکون ہے تو ہی وہ فردوسِ گم شدہ اور متاعِ ربودہ ہے جس کی آرزو اور جستجو میں روحِ عالم سرگرمِ سفر ہے۔

اس کے ساتھ ہی عالمِ اسلام کے حقیقت پسندانہ جائزے سے شاعر دل گرفتہ نظر آتا ہے کہ وہاں کوتاہ نظری، بے ذوقی، اور رجالِ دین کی کم ہمتی اور ذہنی و وجدانی بے بضاعتی عام ہے۔ دانشکدوں اور درس گاہوں اور دینی تعلیم کے مرکزوں میں بھی نظر کی گہرائی و گیرائی، ذوق کی صحت، بیدار مغزی اور وہ عالی ظرفی و بلند مشربی عنقا ہے، جو ان اداروں کا امتیاز تھی، اور جو آج عالمِ اسلام کی قیادت کے علمبردار ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں اس شعلۂ حیات کے پیچھے سرگرداں ہوں جس نے کبھی زندگی کو تب و تاب اور نور و سرور بخشا تھا، میں ان ابطال کو ڈھونڈتا ہوں جو ماضی کے دھندلکے میں گم ہو گئے ہیں، اور اس آتشِ رفتہ کے سراغ میں ہوں جو زمانے کی خاکستر میں چھپ گئی۔

اقبال کو اپنے کلام و پیام کی اہمیت کا اندازہ ہے، اس لئے وہ کہتے ہیں کہ بادِ صبا خس و خاشاک کی پرورش کرتی ہے لیکن میری مسیحا نفسی دلوں کے لئے ذوق و آرزو کا پیام ہے، اور یہ اثر و نفوذ اس لئے ہے کہ میری نواؤں میں خونِ دل و جگر شامل ہے اور میری رگِ نے میں میرا لہو رواں دواں ہے۔

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو — نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق — خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ — میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس — میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش   ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو!

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

اس تخاطب سے خدا کی طرف گریز ہوتا اور شاعر کے ذوق وشوق کا رخ بارگہِ قدس کی جانب ہو جاتا ہے اور مقامِ عبدیت سے شاعر اپنے محبوب ومعبود کے حضور اس طرح لب کشا ہوتا ہے کہ تیری تجلی کائنات کو محیط ہے اور دنیا تیری قدرت کے صحرائے بیکراں کا ایک ذرہ اور وجود زندگی، تیرے وجودِ لامحدود کے بحرِ بےپایاں کا ایک قطرہ ہیں تیرے نور کی تجلی سے ذرہ میں آفتاب کی نمود اور قطرہ میں سمندر کا وجود ممکن ہو جاتا ہے، تیرے جلال کے ظہور سے سلاطینِ عالم اور فاتحین اقوام وامم کی ہستی ستعار اور تیرے جمال کے نور سے زاہدوں عابدوں، اور نوعِ انسانی کے محسنوں کے دل سرمست وسرشار ہیں وہ کہتے ہیں تیرا شوق ہی میری روح کا حدی خواں اور میرے دل کا ترجمان ہے اور وہی میری عبادت اور میری نماز میں لذت وروحانیت پیدا کرتا ہے، اور جب وہ اس ذوق وشوق سے خالی ہوتی ہے تو حضوری کے بجائے دوری ومہجوری اور وصال کی جگہ بعد وانفصال کا پیام بن جاتی ہے عشق وعقل دونوں ہی کو حسب توفیق غیاب وحضور کی خدمت سپرد ہوئی عقل کو بحث وجستجو، غور وفکر، اور اعتماد نفس وخودداری ملی اور عشق کو اضطراب والتہاب شورش وسوزش، ذوق وشوق اور لذتِ حضوری میسر ہوئی دنیا میں پھیلی ہوئی روشنی نورِ آفتاب کے سبب نہیں بلکہ تیرے جمال جہاں آرا اور حسن گیتی فروز کا پرتوِ فیض ہے۔

آخر میں اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی طویل علمی تحقیقات، عالم سادت کا

فتح باب نہ کرسکیں اور اخیر میں یہ کھلا کہ تمام علم وعرفان لاحاصل اور بے نتیجہ تھے جس طرح یہ سمجھنا نادانی ہے کہ علم نباتات کا ماہر تازہ پھلوں کا ذائقہ شناس اور ان کا لذت آگاہ ہے۔

مادیت اور روحانیت کی یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری اور حق وباطل کا معرکہ شروع سے قائم ہے تاریخ اسلام بھی اس سے خالی نہیں وہ اس موقع پر پہلے معرکے کو یاد کرتے ہیں جس میں ابوجہل ذابولہب اور اس کے خلفار مادیت کے علمبردار اور سرور عالم اور ان کے انصار رایت ایمانی کے حامل وجلودار تھے اب عالم عربی اور دنیائے اسلام کا اس میں امتحان ہے کہ وہ ان دونوں مقابل فریقوں میں سے کس کی حمایت وطرفداری کرتا ہے

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے — عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب — مجکو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رُطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا — عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب
گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد — عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب
عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق — وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا — گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب
گرمیِ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق — موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق
(بالِ جبریل)

ذوق و شوق پر ایک سرسری نظر[1]

یہ نظم بھی اقبال کی چند ممتاز نظموں میں ہے اور مسجد قرطبہ کا انداز اس میں بھی بڑی حد تک برقرار ہے تمہید میں مناظرِ فطرت اور جمالِ قدرت کا بیان اور عربوں کی سادہ اور دلکش زندگی کی داستان بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے بیان ہوئی ہے اور پھر سوز و ساز، ذوق و شوق عقل و عشق، مومن کا جلال و جمال، خدا کی عظمت و رفعت کا کمال اور وصل و فراق کا موازنہ اور ان پر تبصرہ سب کچھ آگیا ہے اور نظموں کی طرح اقبال کی فنی مہارت و چابکدستی اور بلیغ منظر کشی و سماں بندی کہ حالات و واقعات کی تصویر نگاہوں میں پھر جائے اور زبانِ حال اور خبر نظر بن جائے، اس نظم میں بھی موجود ہے اقبال اپنی تہ رسی اور دقیقہ سنجی، دروں بینی اور بالغ نظری سے ملکوں، تہذیبوں، مذہبوں، اور قوموں کی روح میں اتر جاتے ہیں اور پھر اپنا ذاتی مشاہدہ اور صداقت کا تجربہ و تجزیہ شعر و نغمہ کے پردوں کی آڑ میں ہو بہو سامنے رکھ دیتے ہیں، وہ مغرب کی نبض شناسی کے ساتھ ہی مشرق اور ایشیا کے بھی واقف اسرار و دانائے راز ہیں، وہ جس طرح عجم کے حسنِ طبیعت کے رمز آشنا ہیں اسی طرح عرب کے سوز دروں کے نکتہ شناس بھی ہیں، وہ ہندوستان و ایران، عرب و افغانستان اور مشرق و مغرب کے مزاج، مذاق اور طرز و انداز و افتادِ طبع اور ان کی فطرت سے پوری طرح آگاہ ہیں، وہ اس نظم میں فلسطین اور عرب کی منظر کشی کے ساتھ اس کے روح و پیام پر بھی

۱؎ اضافہ از مترجم

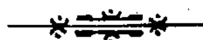
لطیف تبصرے اور اس کی طرف نازک اشارے کرتے گئے ہیں کبھی بجھی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب کے معمولی واقعہ سے عربوں کی کاروانی زندگی اور ان کے ذوقِ عالم نوردی و جہاں بینی کی طرف لطیف اشارہ کرنا انہی کا کام تھا مصرعِ ثانی کی بلاغت و معنی خیزی (SIGNIFICANCE) بھی آپ اپنی مثال ہے۔ ع

کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں!

کا تجاہلِ عارفانہ و تغافلِ شاعرانہ ہمیں انسانی تاریخ کے اس وسیع پس منظر میں پہنچا دیتا ہے جہاں ہم تاریخ کی صبح طلوع ہوتے اور مختلف قوموں خصوصاً یہودیوں، عیسائیوں اور پھر مسلمانوں کے قافلوں اور کاروانوں کو اس مقام سے گذرتے اور سفر کرتے دیکھنے لگتے ہیں اور اس طرح عربوں کی عظمتِ رفتہ کے ساتھ ہی اقوامِ گذشتہ کی پوری تاریخ نگاہوں کے سامنے دفعۃً آجاتی ہے شعر کی بلاغت اس وقت اور سامنے آتی ہے جب ہمارے سامنے یہ تاریخی حقیقت بھی ہو کہ فلسطین اور بیت المقدس شروع سے قافلوں اور کاروانوں کا ملک رہا ہے، اور اس کی حیثیت قوموں کی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ گویا بین الاقوامی، علاقہ کی رہی ہے، اپنی غزل کو آتشِ رفتہ کا سراغ" اپنی سرگذشت کو کھوئے ہوؤں کی جستجو اور اپنی موجِ نفس کو نشو و نمائے آرزو کہہ کر اقبال نے اپنی کلاسکیت، رومانویت، اپنی مشرقیت و اسلامیت اپنے نظریۂ فن کی روحانیت اور فلسفۂ خودی کی طرف بھی بلیغ انداز میں اشارہ کر دیا اقبال کا کارنامہ ملتِ اسلامیہ اور جمعیت انسانی کے دل میں نشو و نمائے آرزو کے سوا اور کیا قرار دیا جا سکتا ہے؟

اپنی آتش نوائی کو خونِ دل و جگر کا نتیجہ کہہ کر اقبال نے ایک بار پھر اپنے نظریۂ فن اور صداقت اظہار کا اعلان اور اپنے کلام کو اپنے نظریے کے ثبوت میں پیش کیا ہے،

پوری نظم پر ذوق وشوق، وجد و سرور، وصل و حضور، عشق کے سوز و ساز اور محبت و جذبیت کے راز و نیاز کی فضا چھائی ہوئی ہے۔



اقبال اور مسئلۂ فلسطین[1]

اقبال کو ذاتی طور پر مسئلہ فلسطین اور عربوں کے مستقبل سے نہایت گہری دلچسپی تھی، ان کے ذاتی خصوصاً مس فارقوہرسن کے نام کے خطوط میں مسئلہ فلسطین کے بارے میں ان کے دلی اضطراب کا پتہ چلتا ہے، وہ مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے (مسلم لیگ کی بدولت) شاید فلسطین کے عربوں کو کچھ فائدہ پہنچ جائے، ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لئے تیار ہوں، ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی چھاؤنی کا مسلط کیا جانا اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے پر خطر ہے"[2]

وہ مس فارقوہرسن کو لکھتے ہیں "فلسطین پر یہودیوں کا بھی کوئی حق نہیں یہودیوں نے تو اس ملک کو رضامندانہ طور پر عربوں کے فلسطین پر قبضہ سے بہت پہلے

---

[1] از قلم مترجم [2] اقبال نامہ ۲/۲۷

خیرباد کہہ دیا تھا صیہونیت بھی کوئی مذہبی تحریک نہیں، علاوہ اس امر کے کہ مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں خود فلسطین رپورٹ نے اس امر کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔[۱]

ہندوستان میں جتنی فلسطین کانفرنسیں ہوئیں سب میں اقبال کے مشورے اور ہمدردیاں شامل تھیں، علامہ نے فلسطین رپورٹ کے خلاف مسلمانان لاہور کی کانفرنس کے موقع پر ایک بیان دیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ :۔

"عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے، مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے، جیسا مشرق قریب کی صورت حال سے واقف کسی شخص کو ہو سکتا ہے یہ مسئلہ مسلمانان عالم کو ایک موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت سے اس امر کا اعلان کر دیں کہ وہ مسئلہ جس کا حل برطانوی سیاستداں تلاش کر رہے ہیں محض قضیہ فلسطین ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا ________ مسئلہ فلسطین کو اگر اسکے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے، بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں مسئلہ یہود تو ۱۳ صدیاں ہوئی حضرت عمرؓ کے یروشلم میں داخلہ سے قبل ختم ہو چکا تھا، فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا بلکہ بقول پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی اور ارادہ سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا، مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا، زمانہ حال کے تاریخی انکشافات نے "پیٹر دی ہرمٹ" کی ہستی ہی کو محل اشتباہ قرار دیدیا ہے الخ"[۲]

---

[۱] اقبال نامہ ۱/۴۴۶ [۲] ایضاً ۱/۴۵۲

پہلی جنگ عظیم کا افسوسناک انجام یہ تھا کہ نزلہ عالم اسلام پر گرا، ادھر ترکی کی خلافتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا، اور اتحادیوں نے سیاسی بندر بانٹ اور تقسیم کا پرانہ حربہ آزادی سے استعمال کیا چنانچہ ترکی کا مشرقی حصہ روس کے ہاتھ لگا، اور مغرب کے یورپی صوبے بلقان، ہنگری، بلغاریہ وغیرہ مکمل طور پر خود مختار ہو گئے، ایران اور شام فرانس کے ہاتھ لگا، اور مصر و عراق پر برطانیہ نے قبضہ جمایا، اس طرح سے عالم اسلام کے حصے بخرے ہو گئے، فلسطین کا مسئلہ ذرا بین الاقوامی نوعیت کا تھا اس لئے اسے "تہذیب و ترقی" کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے برطانیہ کے زیر انتداب رکھا گیا اقبال اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہیں، اور یورپ کی اس سیاسی چال کو سامنے لاتے ہیں کہ وہ پہلے کمزور ممالک کو ظلم کا نشانہ بناتا ہے، اور پھر اس کے غم میں مگر مچھ کے آنسو بھی بہاتا اور ہمدردی ظاہر کرتا ہے، تاکہ عالمی سیاسیات میں ساکھ بھی قائم رہے، اور اپنا مقصد بھی نکل آئے:۔

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

یورپ اس حکمتِ عملی کو تہذیب اور اصلاح، انتداب اور نگرانی کا نام دیتا ہے لیکن یہ استحصال کے سوا اور کچھ نہیں ۔

اقبال کو شک اسکی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر — بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

جمعیت اقوام (LEAGUE OF NATIONS) نے اس زمانے میں بھی عربوں اور ایشیائیوں

کے ساتھ موجودہ امتیازی سلوک جاری رکھا تھا، اور اس پر یہودی اور مغربی ممالک مسلط تھے، اقبال اسی لئے اسے کہیں "داشتۂ پیرکِ افرنگ" کہتے ہیں کہیں ان کفن چوروں سے تشبیہ دیتے ہیں، جو مشرق کو قبرستان بنا کر اسے بھی تقسیم کر لینے کے در پے رہتے ہیں،

ع بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

اقبال مغربی سیاسیات پر یہودیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو سمجھ گئے تھے ان کا خیال ہے کہ ایک نہ ایک دن یورپ ان کے دامِ فریب کا شکار ہو کر رہے گا۔

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار — جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح — دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

اپنی دوسری نظم یورپ اور یہود میں یہی خیال ظاہر فرماتے ہیں۔

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی!

۵ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہودی اور یہود نواز حلقوں کی ایک رائے یہ سننے میں آرہی ہے کہ یہودیوں کو عربوں نے ان کے وطن سے نکالا تھا، اس لئے اگر انھوں نے اپنا وطن دوبارہ زبردستی لے لیا ہے، تو اس میں ان کا کیا قصور، یہ سرزمین تو جیسا کہ صیہونی (ZIONISTS) کہتے ہیں ارض موعودہ (PROMISED LAND) ہے، جہاں ہر یہودی کا آنا ضروری ہے۔

اقبال نے اپنے خطوط و بیانات میں اس کا جواب دیا تھا کہ یہودی فلسطین سے اپنی مرضی سے نکلے تھے، اور یہ "خروج" عربوں کے فتح فلسطین سے پہلے ہی ہو چکا تھا، تاہم اقبال نے یہودیوں کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے ایک چبھتا ہوا سوال

یہ اٹھا دیا کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین اور سسلی اور دوسری یورپین مفتوحہ علاقوں پر کیوں نہیں ہو سکتا ہے، یہودیوں کا یہ دعوا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین امریکہ پر اور ہُن، گاتھ، اور گال قومیں برطانیہ پر دعوا کر دیں یا ہندوستان کے آریہ ایران اور روس پر دعوا کر دیں کہ ان کا وطنِ اصلی واپس دیا جائے ——

اقبال کی نظر میں یہ تاریخ پر ظلم اس کے ساتھ مذاق اور اسے اپنی مرضی سے بدلنے کی مضحک کوشش ہے اگر انھیں وطن دینا ہی ہے تو جرمنی میں دینا چاہیئے جہاں سے وہ نکالے گئے، اپنے دعویٰ سے ہزار سالہ دست برداری اور خاموشی کے بعد یہودیوں کا نیا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے اور اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے:۔

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق　　　ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور　　　قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا!

وہ فلسطینی عربوں کے مضمرات و امکانات اور ان کی صلاحیتوں سے واقف ہیں اس لئے انھیں خودی کی پرورش، اور لذتِ نمود کی خلش کے لئے ابھارنا چاہتے ہیں، اور وہ سوز و ساز یاد دلاتے ہیں جس سے زمانہ اب بھی محروم نہیں ہے۔ اقبال کے پیامِ خودی میں ظاہر ہے کہ عربی جذبات اور اسلامی احساساتِ ایمان و یقین کی کیفیات، روحانی امکانات، اور عزم و ثبات ہی بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ عربوں کو انہی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جنگِ حریت میں آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا اور خودی پر بھروسے کے سوا یورپ یا اقوامِ متحدہ پر اعتماد خوش فہمی یا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں:۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ　　　میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں — فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات — خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے



مسافر غزنی و افغانستان

اقبال نے ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے شہید و مجاہد بادشاہ نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کی سیاحت اور سلطان محمود غزنوی کی راجدھانی غزنی کی زیارت کی تھی، جہاں وہ حکیم سنائی[1] کے مزار پر بھی حاضر ہوئے۔ اقبال سنائی کو رومی کے بعد شعر و حکمت میں اپنا دوسرا استاد مانتے تھے، اس نادر اور زریں موقع نے ان کی طبیعت پر مہمیز کا کام کیا، وہاں انھوں نے جو شعر کہے ہیں وہ ندرت و معنویت کے ساتھ ان کے ذوق و شوق، حسرتوں اور امیدوں کی سچی تصویر ہیں، ان نظموں میں انھوں نے اپنے عہد پر ایک فلسفی شاعر اور انقلابی مسلمان کی طرح نظر ڈالی ہے، اور اپنی زیارت کو تاریخی حیثیت دیدی ہے۔

---

[1] سنائی عہد غزنوی کے مشہور شعرا میں ہیں، ان کی شاعری کا ارتقا غزل گوئی سے ہوا، وہ دربار میں ملک الشعرا تھے لیکن توفیق الٰہی نے انھیں جب اپنا لیا تو دنیا اور شاہی درباروں سے قطع تعلق کرکے حقائق و معارف نظم کرنے لگے ۵۲۵ھ ان کا سن وفات ہے۔

نظم کے شروع میں اقبال نے ہمرہانِ سست عناصر کا گلہ اور دنیا کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا ہے، جو ان کے آفاقی جذبات اور نظریات کے لئے "تنگنائے" بن گئی ہے، اور اس کے کوہ و بیاباں وادیٔ و کہسار، دشت و صحرا بھی ان کے "جنوں" کے لئے کافی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے جس بندے کو علوئے ہمت، بلند مشربی، اور سوزِ عشق دیا ہو اس کے لئے یہ کائنات یقیناً ناکافی ہوگی یہی وجہ ہے کہ مردانِ خدا اور خود آگاہ اپنے کو اس عالم مادی سے آزاد کر لیتے ہیں، اور اپنے لئے نئے آفاق فراہم کر لیتے ہیں، اسے وہ توحید کا راز کہتے ہیں، جو اہل نظر پر خدا بینی کا دروازہ کھول دیتا ہے اور دنیا میں ہوتے ہوئے دوسری دنیا کے مشاہدات و تجلیات سامنے کر دیتا ہے۔

غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا — سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا

یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا — خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں

یہاں اقبال "طریقت و شریعت" کے پرانے معرکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علم و معرفت، اور دین و محبت میں کوئی تضاد اور عناد نہیں، یہ تو مدعیانِ شریعت و حقیقت کی غلط اندیشیاں ہیں، اور یہ فقیہانہ پندار ہے، جس نے معرفت و محبت کو اپنا رقیب بنا لیا ہے، وہ یہاں ایک دوسرا نکتہ بھی بتاتے ہیں کہ شریعت و حقیقت کے پرستاروں کے لئے اصل چیز استغنا اور بے نیازی ہے، جو ان دونوں کی آبرو ہے، مادیت کے پرستاروں اور حکومت کے علمبرداروں سے کنارہ کشی کے بعد اہل دل استغنا ہی کے قلعے میں پناہ لے سکتے ہیں، اس موقع پر انھیں اہل حق کا مجاہدہ، ان کی سرفروشیاں اور سرگرمیاں یاد آجاتی ہیں تو روح الامین سے بھی چشمک کر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فرشتے انسان کی عبدیت اور جوشِ محبت کی تقلید کہاں کر سکتے ہیں۔

رقابت علم و عرفاں کی غلط بینی ہے منبر کی — کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں — زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

یہاں شاعر اپنے عہد کی طرف متوجہ ہوتا اور مشرق و مغرب دونوں پر تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے دونوں کو اپنی چشم جہاں بیں سے دیکھا اور پرکھا ہے، اور دونوں کی خوبیوں اور خرابیوں، مشکلات و مسائل سے واقف ہوں پھر وہ اپنی حکیمانہ رائے اور تجربات کی روشنی میں کہتے ہیں کہ مشرق میں استعداد و صلاحیت بہت ہے لیکن اس کو قیادت اور صحیح رہنمائی نہیں مل رہی ہے، اور مغرب کا حال یہ ہے کہ قوت کا نشہ اور سامان اور وسائل کی فراوانی کا خمار اس پر چھایا ہوا ہے، اور اس افراط نے اس کی زندگی میں تلخی و بدمزگی پیدا کر دی ہے، اس موقع پر انھیں مشرق کے وہ رجال یاد آجاتے ہیں جنھوں نے قیصر و کسریٰ کو چیلنج کیا اور فقر غیور سے بادشاہوں کو بھی لرزہ براندام کر دیا تھا اور ان کا وجود ہی باطل کی موت اور حق و صداقت کی فتح بن گیا تھا، شاعر عالم عربی کے حالات دیکھ کر اور زیادہ حزیں و غمگین ہوتا ہے، اور عرب حکمرانوں اور سیاستدانوں کی بلاد عربیہ سے نا وفاداری اور خود فریبی، لذات و شہوات میں انہماک اور غفلت عیش کوشی پر ایمان و حمیت کے جذبہ سے سرشار ہو جاتا ہے، اور سخت گرفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ شیوخ وامرا گلیم بوذرؓ، دلق اویسؒ، اور چادر زہرؓا بھی بیچ سکتے اور وہ مقامات مقدسہ بھی غیروں سے پامال کرا سکتے ہیں جو دین وملت اور خود ان کی آبرو ہیں۔

شاعر عالم اسلامی میں اجنبی اثرات اور موجودہ حالات کو آشوب قیامت سمجھتا ہے، اور سنائی کا وہ مصرع دہراتا ہے، جو انھوں نے تاتاری حملوں کے وقت میں

کہا تھا کہ چینی اور ترک تو فاتحانہ یا عقیدت مندانہ حرم تک آگئے لیکن مردِ حرم نیند کے مزے لے رہا ہے:۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا
نہ ایراں میں رہے باقی نہ تو راں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ
یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ
حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ حشر سے پہلے نہ کر دے حشر کو برپا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

شاعر اس کے بعد مغربی تہذیب اور یورپ کی پیدا کردہ تمدن کا حکیمانہ تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حیاتِ انسانی منفی اور مثبت قدروں کے اجتماع، باطل کے انکار اور حق پر اصرار کے بغیر مستحکم اور متوازن نہیں ہو سکتی یہی لا الٰہ الا اللہ کا رمز ہے، جس کا پہلا جز تمام معبودانِ باطل، اور مادی طواغیت کی کلی نفی اور دوسرا خدائے برحق کے یقینی اثبات پر مشتمل ہے، مگر یورپ کی بدنصیبی ہے کہ اس نے پہلا دور تو بڑی تیزی سے ختم کر لیا، اس نے قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی بیخ کنی شروع کر دی اور پوپ کی دینی سخت گیریوں کا خاتمہ کر دیا یہ اقدام یقیناً مستحسن تھا، لیکن وہ زندگی کے دوسرے اثباتی دور میں بالکل ناکام اور محروم رہا حالانکہ انسان، معاشرہ اور تہذیب صرف منفی اقدار کے سہارے نہیں چل سکتے اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ یورپ جس نے علم و تنظیم اور قوتِ تسخیر سے دنیا کو زیرِ فرمان کر لیا تھا زندگی کے صحرا میں حیران و ہلکان نظر آنے لگا، نہ اس کے پاس ایمان تھا نہ پاک جذبات تھے، نہ صالح مقاصد و غایات تھیں، اس لئے لازمی طور پر وہ زوال و فنا کے راستے پر چل پڑا اس طرح اقبال نے ان لفظوں میں یورپ کی تاریخی و تمدنی تصویر کھینچ کر

رکھدی ہے، اور یہ نظم ان کی بصیرت و حکمت کا نمونہ بن گئی ہے۔

اقبال، یاس و قنوطیت سے بالکل الگ تھے، اس لئے مشرق کے مستقبل سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ عمر بھر اس کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو ہی کرتے رہے، وہ اس نظم میں بھی کہتے ہیں کہ مشرق قوت و صلاحیت کے ذخیروں سے بھرپور ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اس بحر منجمد سے وہ تیز دھارا بھی اٹھے گا جو فساد و استبداد کے سفینے ڈبو دے گا لیکن اس کے باوجود وہ مغربی استعمار کے عزائم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جس نے اسلامی مشرق کو اپنی سازشوں کا شکار اور اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے جس نے اس کے افکار و خیالات تک کو غلام بنالیا ہے، چنانچہ مشرق خوب و ناخوب کے ذوق و تمیز سے بھی محروم ہوگیا ہے، اور اس کی رائے بے وزن ہوگئی ہے، اس لئے کہ غلامی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی اور کور ذوق بنا دیتی ہے، دنیا میں مردانِ احرار و غیور ہی کی رائے، ان کے خیالات و افکار پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ فراست و بصیرت انہی کا حصہ ہوتی ہیں، اور صاحب زمان اور ابوالوقت وہی ہوتا ہے، جو مستقبل کی جھلک اور گوہر فردا کی چمک پہلے ہی دیکھ لیتا ہے، اقبال کو انہی کی زبان میں سنئے ۔

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے	مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا
دبا رکھا ہے اسکو زخمہ ور کی تیز دستی نے	بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی	نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا
غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی	جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر	کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے	زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

پھر مشرقی دماغوں پر مغربی ثقافت کے سحر و اثر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغرب کے شیشہ گر اور چابکدست صناع نے غیور و جسور، سخت کوش اور خوددار قوموں کو بھی نزاکت و نفاست کا سبق پڑھا کر موم کر لیا ہے، اس کیمیاگر ساحر نے پہاڑوں اور چٹانوں کو بھی اپنی حکمت عملی سے پانی کی طرح رواں اور مٹی کی طرح پامال بنا دیا ہے لیکن میں اس اکسیر کا مالک ہوں جو شیشہ کو پتھر کی وہ صلابت دیتا ہے کہ اسے سیل تند و تیز بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا اور نہ اسے پہاڑوں سے ٹھیس لگ سکتی ہے، میں نے ایمان و استغنا کے ید بیضا سے بڑے بڑے جابر فرعونوں کا غرور توڑا اور مقابلہ کیا ہے میرا شرارہ جو باطل کے خس و خاشاک کو بھسم کرنے کے لئے ہے، وہ کوڑے کرکٹ سے کیوں کر دب سکتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ محبت انسان میں عزت نفس، غیرت و حمیت اور دنیا اور دنیاداروں سے نفرت سکھاتی ہے ——— یہاں پہنچ کر ان کی طبیعت کھل اٹھتی ہے، اور پیغام رسالت کی ابدیت اور آپؐ کی معجزانہ شخصیت کا عشق انھیں مسحور و مخمور بنا دیتا ہے، یہ وہ مقام ہوتا ہے، جہاں اقبال اپنے قابو میں نہیں رہتے اور زمام اختیار ان کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے، وہ عالم سرور و حضور میں کہتے ہیں کہ کوئی تعجب نہیں اگر ستارے میری گرد راہ اور افلاک و کواکب میرے پانداز ہو جائیں، اس لئے کہ میں نے اپنا رشتۂ جاں رکاب رسالتمآبؐ سے باندھا ہے جن کا ستارہ کبھی غروب اور جن کا اقبال کبھی مائل بزوال نہیں ہوتا، جو علم و عرفاں، رسالت و نبوت کا مطلع، اور سیادت و قیادت کا مرجع ہیں، جن کے قدموں سے چھو کر غبار راہ میں وادی ایمن کا نور اور مشت خاک میں عالم پاک کا ظہور دعوت نگاہ دیتا ہے مسافر شاعر یہاں اپنی منزل پر پہنچ کر اپنا سفر ختم کر دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ سنائی کا ادب

کچھ اور کہنے سے مانع ہے۔

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا!

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا!

(بال جبریل)

"مسافر" کی واردات و مشاہدات[1]

اقبال نے اکتوبر ۱۹۳۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا یہ سفر کیا تھا اور واپسی پر اپنی مثنوی "مسافر" لکھی تھی، جو دراصل ملتِ افغان کے نام ایک دعوتی پیغام کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے ہم اقبال کے ساتھ اس وادی عزم و شوق میں بھی کچھ دور سیر سفر کرنا چاہتے ہیں، وہ جب درۂ خیبر سے گزرتے ہیں تو یہاں سے گزرنے والے مردان حق اور تاریخ کے صد ہزار افسانے یاد آجاتے ہیں، وہ بے سبزہ کے کہساروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ان کے سینوں سے رنگ و بو کی نزاکت نہیں اگتی، جہاں کا مور بھی شاہی مزاج اور آہوئے شیراں شکار ہوتا ہے،

---

[1] اضافہ از مترجم

لیکن لامرکزیت نے ان بہادروں کو آشفتہ روزگار اور بے نظام و ناتمام و نیم سوز بنا دیا ہے، اور ان کے بکھروں سے خود ان کے بنائے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہے۔

وہ اقوام سرحد کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی عظمت رفتہ اور اپنی خودی کی بازیافت کرو اسلام میں یہ تجاہل و تغافل حرام ہے، خود آگاہی دین اور زندگی کا پیام او خود فراموشی موت کا نام ہے۔

وہ بڑے درد و سوز کے ساتھ افغانوں سے کہتے ہیں۔

میر خیل! از مکر پنہانی بترس،

از ضیاعِ روحِ افغانی بترس!

وہ افغانوں کو بار بار وحدت و مرکزیت کا سبق یاد دلاتے ہیں کہ یہی راز حیات اور برگ و سازِ کائنات ہے، وہ افغانوں کی پستی اور پسماندگی کا سبب ان کی حال پر قناعت اور مستقبل سے غفلت کو قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قوموں کی ترقی کے لئے امید و آرزو اور ایک متفقہ نصب العین ضروری ہے ——— اقبال نے اس کے بعد نادر شاہ شہید سے ملاقات کی اور انھیں ایک دردمند مسلمان پایا اسلام اور ملت اسلامیہ کے غم میں دونوں دیر تک روتے رہے آخر میں بادشاہ نے اپنی طاقت کو قرآن کی برکت کہا اور اپنے عزائم و افکار کا اظہار کیا اور اقبال نے ان کی اقتدا میں نماز عصر پڑھی، اقبال کہتے ہیں کہ اس نماز شوق کی کیفیت ناقابل بیان تھی۔

رازہائے آں قیام و آں سجود

جز بہ بزم محرماں نتواں کشود

"مسافر" کابل اور بابر بادشاہ کے مزار کی زیارت کرتا ہوا غزنی میں حکیم سنائی کے مزار پر حاضر ہوتا ہے، اور ملت کی زبوں حالی کا علاج پوچھتا ہے جس پر روحِ سنائی جواب میں کہتی ہے کہ قوموں کا وجود "فقر و عشق" سے دوام اور استحکام حاصل کرتا ہے، اور "دل و دین" ہی ہر قوت کا سرچشمہ ہیں، اور یہ دین بزرگوں کی نظر اور اہل دل کی صحبت کے فیض و اثر سے پیدا ہوتا ہے، بوعلی سینا عالمِ آب و گل ہے لیکن خستگی ہائے دل سے بے خبر وہ جسم و تن کا بڑا معالج ہے، لیکن قلب و روح کا درماں اس کے پاس نہیں ۔

دل ز دیں سرچشمۂ ہر قوت است　　دیں ہمہ از معجزات صحبت است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر　　علم و حکمت از کتب، دیں از نظر
بوعلی دانندۂ آب و گل است　　بیخبر از خستگی ہائے دل است
نیش و نوشِ بوعلی سینا بہل　　چارہ سازیہائے دل از اہل دل

"مسافر" غزنی میں سلطان محمود کے مزار پر عقیدت مندانہ حاضر ہوتا ہے، اور قندھار میں خرقۂ مبارک کی زیارت کرتا ہے، اور پھر مؤسس ملتِ افغانیہ احمد شاہ باباؒ کیطرف سے اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جہان شب و روز میں جو صاحب امروز ہے مستقبل بھی اسی کا ہے، اور جو بیداری، سخت کوشی اور کرّاری سے رہتا ہے، وہی زندہ رہ سکتا ہے، یہ کرّاری حیدر کرارؓ کے مقامات میں سے ہے یہ عثمانیوں اور ہندی مسلمانوں میں جب تک باقی رہی ان کا جاہ و جلال بھی رہا اور وہ نہ رہی تو ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا کتاب و سنت ہی اعتبار ملت اور قوت کا ذخیرہ ہیں، قرآن جہانِ ذوق و شوق کی برکات اور سنت "عالم تحت و فوق" کی

فتوحات کی ضامن ہے، قرآن اگر مومن کا جمال ہے تو سنت اس کا جلال۔ قرآن ہی ثبات وحیات کی بنیاد ہے اور کچھ نہیں۔

بر خود از قرآن اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات!



طارق کی دُعا

(اندلس کے میدان جنگ میں)

تازہ دم اور جواں سال طارق بن زیاد جب عربی فوجوں کے ساتھ اندلس میں اترا تو اپنی فوج کے ان سفینوں کو جلا ڈالنے کا حکم دیدیا جن کے ذریعے اس کے لشکر نے دریا عبور کیا تھا اور یہ اس لئے کیا تھا کہ مسلم فوجوں کو پھر بھاگنے اور واپس ہونے کا خیال بھی نہ رہے۔ جلانے کے بعد اس نے اپنے یادگار تاریخی خطبے میں کہا "ایہا الناس این المفر، البحر من ورائکم، والعدو امامکم ولیس لکم واللہ الا الصدق والصبر" لوگو! راہِ فرار کوئی نہیں، سمندر تمہارے پیچھے اور دشمن تمہارے سامنے ہے، اب خدا کی قسم صبر و ثبات، اور سچے مجاہدانہ ذوق و شوق کے سوا تمہارا کوئی ساتھی نہیں ——— اس شعلہ نوائی نے فوج کو دل و جان سے تیار کر دیا اور اللہ تعالےٰ کے بعد اپنے بازوؤں اور تلواروں پر ان کا بھروسہ پختہ ہو گیا۔

طارق نے دشمن کے مقابلے پر صف بندی کے بعد اپنی فوج کا معاینہ کیا تو

اسے معلوم ہوا کہ اسپینی فوج سے عددی طاقت اور فوجی قوت میں وہ بدرجہا کمتر ہے اور کسی رسد اور کمک کی بھی امید نہیں دشمن اپنے ملک میں ہے، وہ ہر وقت اپنی طاقت بڑھا سکتا ہے، لیکن اسلامی فوج غریب الدیار اور اپنے مرکز سے سیکڑوں میل دور ہے، اس لئے کسی بیرونی مدد کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اگر چھینے ہوئے ہتھیار کچھ کام دے سکیں تو خیر ورنہ کسی کی خیر نہیں! اس روح فرسا صورت حال نے طارق کے دل میں قدرتی طور پر تشویش، اندیشے، اور اضطرابی کیفیت پیدا کی اور اسے کوئی تدبیر سوچنے پر مجبور کر دیا، مگر بالآخر اسے ایک ہی حیلہ سمجھ میں آیا کہ فوج کی روحانی طاقت اور ایمانی صلاحیت کو بڑھا کر وہ الٰہی مدد حاصل کی جائے جو ناقابل تسخیر اور غیر مغلوب ہے تائید غیبی پر طارق نے بھروسہ کیا اور یقین کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ ہے کیونکہ اسے اپنے موقف کی صداقت و حقانیت پر پورا اطمینان تھا کہ یہ فوج حزب اللہ اور جنود الرحمٰن ہے، یہ ملک گیری، جوع الارض کی تسکین اور اپنا اقتدار منوانے کے لئے نہیں نکلی ہے بلکہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور حق و صداقت کو سربلند کرنے کے لئے آئی ہے، وہ اس لئے سر ہتھیلی پر لیکر نکلے ہیں، کہ لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف، انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگنائے سے وسعتِ آفاق کی جانب اور مذاہب کے ظلم و ستم سے بچا کر اسلام کے عدل و اعتدال کی سمت رہنمائی کرے، اللہ تعالٰی نے اس مقصد سے معرکہ آرا ہونے والوں کی فتح و ظفر کا وعدہ کیا ہے: "وَاِنَّ جندَنا لهم الغالبون"۔

اس موقع پر مسلمان کمانڈر نے اپنے رب سے دعا کی اور اس کی مدد کا طالب ہوا، مسلمان قائد اس وقت رسولِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر رہا تھا جنھوں نے

پہلی اسلامی فوج کی قیادت کی تھی اور بدر کے میدان میں صف آرائی کے بعد خلوت عریش میں جاکر اور سجدے میں گر کر اپنے خدا سے رو رو کر عرض کیا: اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لن تعبد؟ (اے خدا اگر یہ جماعت آج ہلاک ہوگئی تو پھر دنیا میں تیری عبادت نہ ہو سکے گی)

چنانچہ طارق نے اپنے پیغمبر اور اپنے سردار کی تقلید کرتے ہوئے ایسی دعا مانگی جیسے عام طور پر قائد اور فاتح نہیں مانگا کرتے اور نہ کسی کو اس کا خیال ہی آتا ہے اقبال نے اس عروس جمیل کو لباس حریر پہنا کر اور دلآویز بنا دیا ہے، طارق نے اپنی دعا میں کہا کہ —— اے خدا! یہ بندے جو تیرے راستے میں جہاد کے لئے نکلے ہیں اور تیری رضا ڈھونڈتے ہیں یہ پراسرار بھی ہیں، اور صاحب اسرار بھی ہیں، ان کی حقیقت اور ان کا مقام تیرے سوا کوئی نہیں جانتا، تو نے انھیں عالی ہمتی اور بلند پروازی سکھائی ہے، اس لئے وہ عالمی سیادت اور عالمگیر حکومت الٰہیہ سے کم پر راضی نہیں ہوں گے، یہ بطل غیور وہ ہیں، جو تیرے سوا کسی سے نہیں دبتے اور کسی کی نہیں سنتے، صحرا اور دریا ان کی ٹھوکروں کے اشارے پر چلتے ہیں، اور ان کی ہیبت اور رعب و دبدبہ سے پہاڑ بھی گرد ہو جاتے ہیں، تو نے انھیں اپنی محبت کا آشنا بنا کر دو عالم سے بیگانہ بنا دیا، ذوق شہادت اور شوق جہاد کے سوا دنیا اور دنیا کی حکومت بھی ان کے لئے کوئی چیز نہیں، اور محبت دل میں گھر کرنے کے بعد یہی کچھ کرتی ہے۔ یہی ایک دھن ہے، جو انھیں اس دور دراز ملک تک لے آئی ہے، یہ لگن مومن کی آخری خواہش اور سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے۔

دنیا ہلاکت کے دہانے اور تباہی کے غار پر کھڑی ہے، انھیں اس میں گرنے سے عرب اپنی جان دے کر اور خون بہا کر ہی بچا سکتے ہیں، دنیا عربی خون کے لئے

پیاسی ہے، اس کی تشنگی اور بیماری اسی مقدس خون سے دور ہو سکتی ہے خیابانِ گیتی میں لالہ و گل اسی سرخ خون کے منتظر ہیں کہ اسے اپنا غازۂ رخسار بنائیں ہم اس سرزمین میں اسی لیئے آئے ہیں کہ اپنے جسم و تن کا بیج بوئیں اور خونِ دل سے اس کی آبیاری کریں تاکہ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہانے لگے اور خزاں کے طویل عہد کے بعد بہاریں لوٹ آئیں ۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذت آشنائی!
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے — قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

اے خدا! تو نے صحرا نشینوں اور اونٹوں کے چرواہوں پر اپنے وہ مخصوص انعام کیئے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں، تو نے انھیں، نیا علم، نیا ایمان اور نیا طرز زندگی بخشا، تو نے انھیں اذانِ سحر کی دولت دی جو علم صحیح، ایمان قوی، اور ذوق سلیم سے عاری، دنیا میں توحید کی کھلی دعوت ہے، جو لوگوں کو غفلت و جہالت کی نیند سے بیدار کرتی ہے، عربوں نے اس کے سہارے دنیا پر چھائے ہوئے موت کے سناٹے کو توڑا اور اندھیریوں میں ڈوبی ہوئی دنیا کو صبح نو کی بشارت دی، زندگی نے حرکت و حرارت کھو دی تھی، اور اس کی محرومی پر صدیاں گزر چکی تھیں بالآخر اس نے عربوں کے سوز دروں اور جگر لخت لخت سے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا اور ایمان و محبت کو حاصل کیا یہ مجاہد موت کو زندگی کی انتہا اور جان کا زیاں نہیں سمجھتے بلکہ اسے نئی زندگی کا فتح باب اور

عیش تازہ کا سامان بجانتے ہیں، یا رب! امت مومنہ کو پھر ایمانی حمیت اور لغض فی اللہ دے جس کا ظہور دعائے نوح میں ہوا تھا کہ انھوں نے دل برشتہ ہو کر کہا تھا، "رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا" تاکہ یہ فوج عالم کفر و فساد کیلئے برق صاعقہ فگن بن جائے، انھیں عزم و یقین دے اور لوگوں میں ان کا وہ رعب قائم فرما کہ ان کی نگاہ، سپاہ اور ان کی للکار، تلوار بن جائے:۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا!	خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو	وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو	ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے	وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں!
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے	نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

(بال جبریل)

اس مومن مخلص قائد کی دعا قبول ہوئی اور اسلامی فوج اپنے اس دشمن کے مقابلے میں کامیاب ہوئی جو طاقت اور عددی اکثریت میں اس سے کئی گنا بڑا تھا اور عیسائی اندلس، اسلامی اور عربی اندلس بن گیا اور مسلمانوں کی وہ پائیدار حکومت قائم ہوئی جو صدیوں تک رہی اور پھر اس کا خاتمہ اسی وقت ہوا جب طارق اور اس کے ساتھیوں کی روح ان میں باقی نہیں رہی اور وہ نصب العین یاد نہیں رہا جو انھیں یہاں تک لایا تھا، جذبۂ ایمانی کا فقدان، طاؤس و رباب کے مشاغل اور خانہ جنگیوں نے حکومت کے ساتھ ہی مسلمانوں کا وجود یہاں تک خطرے میں ڈال دیا کہ ایک متنفس بھی باقی نہ رہا، غافلوں اور خود فراموشوں کے ساتھ خدا کا ہمیشہ یہی معاملہ رہا ہے، "ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا"

ساقی نامہ

ساقی نامہ" اقبال کی منتخب نظموں میں شمار ہوتا ہے، خیالات وافکار کی پختگی اور قطعیت تو اس میں نمایاں ہے، ادبی، اور فنی لحاظ سے بھی اردو میں ایک منفرد شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، یہ شاید اردو میں پہلا "ساقی نامہ" ہے، جس میں اس روایت کی بنیاد ڈالی گئی ہے، اردو کے علاوہ خود فارسی میں بھی ظہوری وغیرہ کا ساقی نامہ، اپنی بہت محدود دنیا رکھتا ہے، لیکن اقبال کی عبقریتِ فکر کا کمال یہی ہے کہ وہ جس صنفِ سخن کو ہاتھ لگاتے ہیں اسے بلند تر کر دیتے اور لفظ و معنی کی دنیا میں اپنے جہانِ نو کی بنیاد رکھ دیتے ہیں، فارسی اور اردو میں میر حسن اور نسیم کی یا دوسری مثنویاں صرف بیانیہ حیثیت رکھتی ہیں اور واقعہ نگاری کے لئے مفید ہیں، لیکن تفکر اور نازک خیالی کے لئے انھیں بیچ بیچ میں غزلیں لکھنا پڑتی ہیں، اس کے برخلاف اقبال نے مثنوی میں قصیدہ اور غزل دونوں کی روح بھی برقرار رکھی ہے، اور مثنوی کو سیدھی اور سپاٹ ہونے سے بچایا ہے، الفاظ کی روانی، خیالات کی جولانی اور سیلانِ شعور (STREAM OE CONSCIOUSNESS)

کی جو کیفیت ہے وہ اقبال ہی کا حصہ ہے۔[1]

اقبال تمہید میں حدیث بہار کہتے ہیں کہ موسم گل آ گیا، دشت و جبل میں اس کے نقیب پھیل گئے، لالہ و گل، نسرین و ریاحین کی حکومت نے اپنا نقشہ جما لیا، پتھروں اور جمادات میں بھی بہار نے زندگی پیدا کر دی، دنیا کو فرح و سرور کی بدلیوں نے گھیر لیا، اس نشاط افزا ماحول میں چڑیاں گھونسلوں سے باہر آ گئیں چشمے اور ندیاں سینۂ کوہ سے نکل کر میدانوں میں زندگی کی طرح جھومتی آگے بڑھنے لگیں کبھی دھیرے اور کبھی تیز، رکتی اور اچھلتی، چٹانوں کو توڑتی اور کہساروں سے ٹکراتی اور زندگی کے نغمے سناتی ہوئیں رواں دواں ہیں، اقبال اس نغمے پر کان لگاتے ہیں تو اس سے زندگی کا پیام سنتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ بہتے ہوئے دریا گھومتے اور مڑتے ہوئے اپنے مقاماتِ سفر بدلتے رہتے ہیں، لیکن زندگی اور حرکت سے خالی نہیں رہتے، ان کا فیضان جاری اور سیلان باقی رہتا ہے۔

زندگی کا بھی کچھ یہی انداز ہے، وہ زمان و مکان کی ہر رہ گزر سے گزرتی ہے لیکن کہیں سکون پذیر نہیں ہوتی، بہار کے ان دلکشا مناظر میں اقبال عبرت و بصیرت پا لیتے ہیں اور اسے وہ اپنی امیدوں کے مرکز یعنی ملت اسلامیہ کی نئی نسل کو دیتے ہیں

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل، لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

---

[1] اضافہ از مترجم

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام! — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصل گل روز روز
وہ مئے جس سے روشن ضمیر حیات — وہ مئے جس سے ہے مستیٔ کائنات
وہ مئے جس میں ہے سوز و ساز ازل — وہ مئے جس سے کھلتا ہے راز ازل
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اقبال کہتے ہیں زمانہ کا طرز و انداز بدل گیا، یورپ کے اسرار فاش ہونے لگے اور مشرق کے خلاف اس کی سازشوں کا راز کھل گیا اور اس نے یورپی شاطروں کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا، مغربی سیاست کا افلاس اور اس کی کہنہ روایات کا دیوالیہ پن ایسا رسوا ہوا کہ لوگ امارت و ملوکیت کے نام سے چڑنے لگے اور امیروں اور بادشاہوں کو چیلنج کرنے لگے، سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی کا زمانہ لد گیا اور وہ ڈرامہ ختم ہوا جسے ہوس پسند بادشاہوں نے صدیوں کھیلا تھا، اور نیند کے ماتے گراں خواب عوام بھی بیداری کی کروٹیں بدلنے لگے، ہمالہ سے زندگی کے سوتے پھر سے ابلنے لگے اور فاران کی تجلی، اور سینا کی روشنی پھر ظہور کے لئے بے تاب ہونے لگی ——— وہ حسب عادت یہاں سے روئے سخن اپنی محبوب ملت اسلامیہ کی طرف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان اگرچہ توحید سے سرشار ہے، لیکن بدعت و وثنیت کے جراثیم سے وہ پوری طرح پاک نہیں اس کے علم و ثقافت، اور کلام و تصوف عجمی اثرات سے محفوظ نہیں ہیں حقیقت پر

وہم وخرافات کا سِتم اب بھی جاری اور امت پر فسون وافسانہ کا طلسم اب بھی طاری ہے خطیب و واعظ حسن کلام کا جادو جگاتے ہیں لیکن ذوق وشوق کے لطف ولذت سے نا آشنا ہیں، ان کی باتیں منطق وہ فلسفہ کے آداب کے مطابق اور فصاحت کے اصول کے موافق ہیں، لیکن قلب وروح کی گہرائیوں میں نہیں اترتیں ـ

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

وہ صوفی جو خدمتِ خلق، تلاش حق اور غیرت دینی کے لئے مشہور تھا، اسے عجمی فلسفے نے اپنا صید زبوں بنالیا اور احوال ومقامات میں کھوگیا، مجموعی طور سے عالم اسلام زوال کے اسقدر قریب آگیا کہ مسلمانوں کا سوزِ عشق بجھ چلا، شعلۂ حیات راکھ بن گیا، اور مسلمان کا وجود وعدم برابر ہوگیا ـ

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر وسلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا،
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
دلِ طور وسینا وفاراں دونیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیمؑ!
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھوگئی
یہ امت روایات میں کھوگئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیان اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا، — یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبال مخلصانہ دعا کرتے ہیں کہ خدا پھر اس امت میں روح زندگی بیدار کرے اس کی عظمت رفتہ اسے واپس دلا دے اور اس کے وجود میں سوزِ دروں اور شعلۂ محبت کو ایک بار پھر بھڑکا دے کہ وہ اس سے اپنی نشاۃ ثانیہ کا سامان کرے، اور محبت کے پر دل سے پرواز کر کے وہاں پہنچے جہاں گرانبار مادہ پرست نہیں پہنچ سکتے، وہ آرزو کرتے ہیں کہ اس پسماندہ امت کو ایک بار پھر قلب علی مرتضیٰؓ کی دھڑکن اور صدیق اکبرؓ کی دھن اور لگن عطا ہو اور اسے دوبارہ وہ "سوزِ مشتاقی" مرحمت ہو جو زندہ قوموں کو ملا کرتا ہے، یہاں شاعر عزو ناز اور عشق و ایمان کے احساس سے سرشار ہو اٹھتا ہے، اور کہتا ہے کہ" اے خدا! تیرے آسمان و زمین برحق اور تیرا اجلال و جبروت ابدی ہیں، مسلم جوانوں کو بھی تو اس کا رازداں بنا اور انکے دلوں میں زندگی کا سوز و ساز اور درد و گداز پیدا کر دے اور میری جیسی محبت و دلسوزی اور حکمت و بصیرت انھیں بھی عطا کر، میرے سفینے کو گرداب سے نکال اور منزل پر پہنچا، اور موت و حیات کے اسرارِ نہاں سے مجھے بھی آگاہ کر اس لئے کہ تجھ سے بڑھ کر علیم و خبیر کوئی نہیں۔

اے میرے مالک و آقا! میرے پاس یہی چند آلام و افکار ہیں، جنھوں نے

مجھے دیدۂ بے خواب اور ماہیٔ بے آب بنا رکھا ہے، میرا سرمایہ یہی خام امیدیں اور ناکام تمنائیں ہیں، جن کے سہارے میں جی رہا ہوں، میری کائنات میری آہیں ہیں، جن سے رات کا سناٹا توڑتا ہوں، میری کل پونجی وہ چند ساعتیں ہیں، جب میں تیرے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرتا اور عرض پرداز ہوتا ہوں یا وہ چند لمحات ہیں جب میں انجمن آرزو میں اپنا ذوق و شوق بکھیرتا اور اپنے اشک گوہر رشک بہاتا ہوں۔

اے میرے مولیٰ! تو نے میری فطرت کو ایسا آئینہ بنایا جس میں روح عصر کا ہر رُخ جھلک اٹھتا ہے، اور جس میں الہام غیبی کی تصویر کھنچ جاتی ہے اے میرے ملجا و ماویٰ! میرا دل ہی رزم گاہ حیات ہے جہاں خیر و شر کے معرکے برپا ہوتے رہتے ہیں، اور ظن و تخمیں، اور ایمان و یقین کی پکار جاری رہتی ہے، میرے رب! یہی کل میری کائنات ہے میں التجا کرتا ہوں کہ اس سرمایۂ حقیر اور متاعِ فقیر کو نوجوانانِ اسلام میں لٹا دے اس لئے کہ وہی اس کے اہل اور مستحق ہیں:۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا ۔۔۔ وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پَر لگا کر اڑا ۔۔۔ مری خاک جگنو بنا کر اڑا!
خرد کو غلامی سے آزاد کر ۔۔۔ جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے ۔۔۔ نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق دے ۔۔۔ دلِ مرتضےٰ، سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر! ۔۔۔ تمنا کو سینوں میں بیدار کر!
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر ۔۔۔ زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے ۔۔۔ میرا عشق، میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوتِ انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت، آئینۂ روزگار — غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

اس کے بعد انھوں نے فلسفۂ حیات، کثرت میں وحدت اور زندگی کے مختلف مظاہر میں ظہور، اس کے تغیر و تبدل، اس کی قوت و سرعت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے یہ حصہ ادب و فلسفہ کا شاہکار سمجھا جا سکتا ہے خصوصاً یہ اشعار اپنی معنویت کا جواب نہیں رکھتے۔

دما دم رواں ہے یم زندگی — ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوق پرواز ہے زندگی
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

آخر میں اس مسلم نوجوان کو نصیحت کرتے ہیں جو مادی ترغیبات کا اسیر ہوتا جا رہا ہے کہ جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو اور شریف آدمی اپنی عزت اور حیثیتِ عرفی

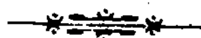
کھو دیتا ہو وہ اس کے لئے سم قاتل ہے، روزی وہی ہے جس میں آبرو محفوظ ہو اور آدمی سر اٹھا کر چلے، وہ اسے اپنی شخصیت و خودداری کی قیمت سمجھاتے ہیں اور سجدۂ شوق کے اسرار فاش کرتے ہیں، جو ہر سجدے سے بے نیاز کر دیتا ہے پھر اسے وہ نئی فتوحات اور ترقیات نئی پیش قدمیوں اور نئی مہمات کے لئے آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی جرأت و عزیمت سے ان نئی دنیاؤں کا انکشاف بھی کرلے جو علمائے طبیعات و سائنس کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہیں آتیں۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیائے رنگ و بو جس پر موت کی حکمرانی ہے، جو جنت نگاہ اور فردوس گوش ہے، جس میں بہت سے آدمی صرف اکل و شرب کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں ـــــ خود آگاہوں کی نگاہ میں منظر اولیں کی حیثیت رکھتی ہے، منزل آخریں کی نہیں، یہ ہمارا آشیانہ اور آخری نشانہ نہیں اور روح بیتاب کا مولد و منشا یہ خاک پامال نہیں، انسان سرچشمۂ کائنات ہو سکتا ہے لیکن یہ کائنات اس کی اصل نہیں ہو سکتی، وہ مومن کو جرأت و جسارت کا پیام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم ہر لمحہ آگے بڑھتے اور سامانِ سفر تازہ کرتے رہو اور مادیت کے کہسار کو ٹھوکروں سے توڑتے رہو، جو جادۂ زندگی کے ہر موڑ پر حائل ہوتا ہے، زمان و مکان سے تم بغاوت اور ان کی اطاعت سے نفرت کرو اور ان کے حدود و قیود سے اپنے کو آزاد کر لو ان کی سرحدوں سے آگے بڑھ جاؤ۔ اس لئے کہ مومن جب خود کو پہچانتا ہے تو وہ اس دنیا کو اسیر کر لیتا اور ارض و سما کو اپنا نخچیر بنا لیتا ہے ـــــ وہ کہتے ہیں کہ یہاں ایک دنیا نہیں ہزاروں جہانِ نادیدہ ہیں، اس لئے کہ دل کائنات کی جھولی ابھی خالی نہیں ہوئی اور اس کی تازہ کاری ابھی ختم پر نہیں آئی یہ دنیا تمہارے اقدام کی منتظر اور مشتاق ہے وہ تمہارے

فکر و عمل کے حدود کے اعتبار سے اپنے وجود میں بھی پھیلاؤ پیدا کرتی ہے، گردش دوراں کا مقصد ہی یہی ہے کہ تم پر تمہارے مضمرات و امکانات کو روشن کر دے اور تمہاری حقیقت تمہارے سامنے لائے، تم فاتح کائنات اور بے نیازِ تعریف و صفات ہو، فرشتے بھی تمہارے احوال و مقامات کی تمنا کرتے ہیں، لیکن تم وہ طائر بلند بام ہو جہاں تک ان کی پرواز نہیں ۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
خودی کے نگہباں کو ہے زہرناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کیلئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود!

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار[1]



[1] بالِ جبریل۔

ابوجہل کی نوحہ گری

جاہلیت کا سردار اور عربی قومیت کا علمبردار عمرو بن ہشام (ابوجہل) اسلامی عہد کے مکہ کی عالم خیال میں زیارت کرتا ہے جو ایمان و یقین کا مرکز اور توحید و رسالت کا گہوارہ بن چکا ہے، اور اب اس کے حرم میں لات و منات کی جگہ ہر طرف طواف کرنے والے عبادت گزار اور زاہدین شب زندہ دار رکوع و سجود، تسبیح و تہلیل، تحمید و تمجید اور ذکر و استغفار کے مبارک احوال میں نظر آتے ہیں اب نہ یہاں مادیت کے اصنام ہیں، نہ جاہلیت کے بت ہبل و عزیٰ اساف و نائلہ کی بڑائی اور دہائی کی جگہ اب مؤذن بلند آہنگ سے اس کے اونچے مناروں سے توحید و رسالت کی منادی کرتا اور ایک خدا کی کبریائی اور رسول اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کی ابدی رسالت کی گواہی دیتا ہے۔

جاہلی فخر و غرور، نخوت اور پندار تفوق نسلی برتری اور امتیاز کی جگہ اب انسانی مساوات اور اسلامی اخوت کا دور دورہ ہے اب لوگ بنی نوع انسان کو

ایک برادری سمجھتے ہیں جس میں عرب وعجم سب برابر ہیں، شرف وعزت کا اگر کوئی حقیقی معیار ہے، تو وہ صرف تقویٰ اور اخلاقی برتری ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

ابوجہل عربوں کی آوازوں پر کان لگاتا ہے تو کسی آنے جانے والے کی زبان سے قوم، وطن اور خاندان سے متعلق فخریہ کلمات نہیں سنتا، اس نے لوگوں میں گھوم پھر کر بھی دیکھا، لیکن اسے ایسا کوئی نہیں مل سکا جو کسی کو کسی پیشہ اور کسی ذاتی یا نسلی عیب کی وجہ سے حقیر جانتا ہو اور اسے چھیڑتا ہو، یا کالے اور گورے کی تمیز برتتا ہو، یا عرب کو عجم سے برتر سمجھتا ہو، وہ محفلوں اور مجلسوں میں جا کر بھی دیکھتا ہے تو عدنان و قحطان، ربیعہ و مضر، عبد مناف و عبد الدار، بنی ہاشم اور بنی عبد شمس کے درمیان کوئی خاندانی چشمک اور چپقلش ذرا بھی باقی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک حبشی غلام کے گرد علم سیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑتے ہیں، اور اس کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں، وہ عرب عوام کی ملاقاتوں، ان کے طور طریق، عادات و اخلاق، ان کے فکر و عقیدہ کو بڑے غور سے دیکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی جاہلی رسم و رواج، عربی عصبیت اور احساس قومیت اسے نظر نہیں آتا جس سے اس کا جی خوش اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

اسے معلوم ہوا کہ پرانی زندگی کے آثار بالکل مٹا دیے گئے ہیں، اور ان کی جگہ عقیدہ و اخلاق، اور صلاح و تقویٰ کی بنیادوں پر ایک نیا معاشرہ وجود میں آگیا ہے، پرانی قدریں اور پیمانے بالکل بدل گئے ہیں، اور ان کی جگہ نئے اخلاقی معیاروں نے لے لی ہے، اس صورت حال سے اسے دکھ ہوتا ہے، اور وہ حیرت و حسرت کے

عالم میں یہ شعر پڑھتا ہوا سنا جاتا ہے۔

فما الناس بالناس الذین عهدتهم
ولا الدار بالدار التی کنت اعرف

(اب نہ وہ میرے شناسا لوگ ہیں اور نہ میرا جانا پہچانا وہ گھر
ہی رہ گیا ہے)

بنی مخزوم کا یہ سردار اپنے وطن میں اجنبی اور اپنے گھر میں پردیسی بن گیا ہے
وہ اس مکہ کو بھی نہیں پہچان پا رہا ہے، جہاں کا وہ معزز شہری اور رئیس تھا، وہ
سوچتا ہے کہ کاش وہ بیت اللہ، وہ حطیم، وہ حجر اسود، وہ بیر زمزم، وہ قریشی سرداروں
کی مجلسیں دکھائی دیتیں جن میں وہ مسلمانوں کو ستاتے اور چھیڑتے تھے ——
—— اور جن میں وہ بھی شریک ہوتا تھا، وہ اسلامی مکہ کو دیکھ کر کبھی سوچتا ہے
کہ میں کہیں غلطی سے راستہ تو نہیں بھول گیا ہوں؟

اسے اپنی گزشتہ زندگی یاد آتی ہے جب وہ محمد کے دین جدید کو عربی قومیت
اور قریشی عصبیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا اور اسلامی نظام کو نسب و وطن
کے جاہلی نظام اور قریشی مملکت کے محدود دائرے کے لئے چیلنج جانتا تھا۔

وہ عزت وفضیلت کو صرف عربوں کی میراث سمجھتا اور دوسروں کو عجمی اور
گنوار قرار دیتا تھا جو کسی قدردانی اور کسی رحم وکرم کے مستحق نہ تھے، وہ اپنے خیالات
کی وجہ سے جاہلیت کے دفاع میں اسی لئے سب سے آگے تھا، وہ اسلام کے دوررس
انقلابی نتائج کو پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اسے آخر اس حد تک کامیابی ہوگی کہ
جاہلیت اپنے مرکز ہی میں غریب الدیار اور ناآشنائے روزگار ہو جائے گی،

ابوجہل انہی خیالات میں گم تھا، اور جب یہ سلسلہ ٹوٹا تو اس میں ایک بار پھر جاہلی نخوت ابھری اور اس کی روح نے انگڑائی لی اور کعبہ سے لپٹ کر وہ محمد رسول اللہ کے خلاف دہائی دیتے ہوئے کہنے لگا، ہمارا دل زخمی اور ہماری روح مجروح ہے، محمد نے کعبہ کا چراغ بجھا دیا اور اس کی قدر و منزلت خاک میں ملا دی انھوں نے قیصر و کسریٰ اور ملوک و سلاطین کے محلات کھنڈر بنا دیے۔ اور اَن الحکم الا للّٰہ وان الارض للّٰہ یورثہا من یشاء کہہ کر ہمارا نظام کہنہ ہی ختم کر دیا انھوں نے ہمارے نوجوانوں پر ایسا سحر کیا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے اور ان کے دین اور ان کی شخصیت کے گرویدہ ہو کر رہ گئے، کیا لا الہ الا اللہ، سے بھی بڑھ کر کوئی کفر ہو سکتا ہے جسے پڑھنے کے بعد ایک خدا کے سوا دو تمام خدا غیر معتبر ٹھہرتے ہیں، جو قوموں کی تاریخ میں مذکور ہیں انھوں نے آبائی دین کا نام ہی مٹا کر رکھ دیا، لات و منات کی عزت خاک میں ملا دی کاش دنیا ان سے اس کا بدلہ لیتی! عجیب بات ہے کہ انھوں نے محسوس اور مشہود خداؤں کا تو انکار کیا لیکن ان دیکھے خدا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اور ایمان بالحاضر کو ایمان بالغیب کے مقابلے پر کمتر بنایا، آخر اس غیب کی اساس اور نامشہود کا وجود کیونکر مانا جا سکتا ہے؟ کیا غائب کو سجدہ کرنا سادہ لوحی اور وہم پرستی نہیں؟ کیا کسی غائب کے سامنے کسی آدمی کو سجدے میں وہ لذت مل سکتی ہے جو سنگ و خشت کے اصنامِ تراشیدہ کے سامنے ملتی ہے؟

سینۂ ما از محمد داغ داغ ۔۔۔ از دم او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود! ۔۔۔ نوجواناں را ز دستِ ما ربود!
ساحر و اندر کلامش ساحری است ۔۔۔ ایں دو حرف لا الٰہ خود کافری است

تا بساطِ دینِ آبا در نورد ‌‌ ‌ با خداوندانِ ما کرد آنچه کرد!
پاش پاش از ضربتش لات و منات ‌‌ ‌ انتقام از وے بگیر اے کائنات
دل بغائب بست و از حاضر گسست ‌‌ ‌ نقشِ حاضر را فسونِ او شکست
دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست ‌‌ ‌ آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست
پیشِ غائب سجدہ بردن کوری ست ‌‌ ‌ دینِ نَو کور است و کوری دوری است
خم شدن پیشِ خدائے بے جہات ‌‌ ‌ بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت

ابوجہل کہتا ہے" محمد کا دین وطنیت اور قومیت کے لئے موت ہے اور وہ خود قریشی ہو کر غلاموں کی عزت کرتے ہیں، اور امیر کو فقیر پر، عربی کو عجمی پر ترجیح نہیں دیتے، اپنے غلام کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، افسوس انھوں نے احرارِ عرب کی قدر افزائی نہیں کی اور عجمی گنواروں اور کالے غلاموں کو ان کا ہمسر بنا دیا اور سفید فام آقاؤں کو کالے بھجنگے غلاموں سے، کریم کو لئیم سے، اور برتر کو کمتر سے ملا دیا اور عربوں کی ناک کٹوا دی، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ اسلامی اخوت محمد نے عجمی تخیل سے لی ہے، وہ سلمان فارسی اور ان جیسے عجمیوں کے فریب خوردہ ہیں، اور انھوں نے اپنی ذہنی اپج سے عربوں کے لئے مصیبت کھڑی کر دی کہ اس ہاشمی جوان نے اپنی قیمت اور حیثیت کو خود ختم کیا اور اسے اس کی نمازوں نے سادہ لوح بنا دیا، کیا کسی عجمی کا شجرۂ نسب ہمارے جیسا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ نطقِ اعرابی اور لہجہ مضری میں بات کر سکتا ہے؟ عرب دانشورو! اٹھو اور محمد کے وحی و الہام کو اپنے پروپگنڈے سے ختم کر دو اور عربیت کو زندہ کر دکھاؤ۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب ‌‌ ‌ از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست ‌‌ ‌ با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

قدر احرار عرب نشناختہ ‌ ‌ ‌ ‌ باکلفتانِ حبش درساختہ
احمراں باسوداں آمیختند ‌ ‌ ‌ ‌ آبروئے دودمانے ریختند!
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی ست ‌ ‌ ‌ ‌ خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است ‌ ‌ ‌ ‌ رستخیزے بر عرب آوردہ است
عزتِ ہاشم زخود مہجور گشت ‌ ‌ ‌ ‌ از دو رکعت چشم شاں بے نور گشت
اعجمی را اصل عدنانی کجاست ‌ ‌ ‌ ‌ گنگ را گفتارِ سحبانی کجاست
چشم خاصانِ عرب گردیدہ کور ‌ ‌ ‌ ‌ بر نیائی اے زہیر از خاک گور؟
اے تو مارا اندریں صحرا دلیل ‌ ‌ ‌ ‌ بشکن افسونِ نوائے جبرئیل

وہ حجر اسود سے کہتا ہے کہ تو ہماری ہاں میں ہاں کیوں نہیں ملاتا؟ ہبل سے کہتا ہے، اے ہمارے معبودِ اکبر! تم کیوں نہیں اٹھ کر ان بے دینوں سے اپنا پرانا گھر چھین لیتے اور ان پر ٹوٹ بول دیتے ہو؟ تم اپنے ساتھیوں کو لیکر آگے بڑھو یا کوئی آندھی بھیجدو جو انھیں تہس نہس کر کے رکھدے ——— اے لات و منات! خدارا تم ہمارے دیس کو چھوڑ مت جانا اور اگر اس کے لئے مجبور بھی ہو جاؤ تو للہ ہمارے دلوں سے مت کوچ کرنا اور یہاں سے بھی جانا ہے تو کچھ اور ٹھہر جاؤ کہ تمہیں ایک نظر بھر کر دیکھ لیں :-

باز گو اے سنگ اسود باز گوے ‌ ‌ ‌ ‌ آنچہ دیدیم از محمد باز گوے
اے ہبل! اے بندہ را پوزش پذیر ‌ ‌ ‌ ‌ خانۂ خود را زبے کیشاں بگیر
گلۂ شان را بگرگاں کن سبیل ‌ ‌ ‌ ‌ تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل
صرصرے دہ با ہوائے بادیہ ‌ ‌ ‌ ‌ انھم اعجاز نخل خاویہ

اے منات اے لات ازیں منزل مرو گر ز منزل میروی از دل مرو

اے ترا اندر دو چشم ما وثاق

مہلتے "ان کنت ازمعت الفراق"[1]



---

[1] جاوید نامہ ۶۰-۵۸

جاہلیت کی بازگشت

شاعر اسلام اقبال نے جاوید نامہ میں جہاں اپنی سیر علوی کی سرگذشت لکھی ہے وہیں، وادی زہرہ میں اس محفل کی منظر کشی بھی کی ہے جہاں اقوام کے خدایان کہن جمع تھے، جن کی جاہلی دور کے انسانوں نے پوجا کی تھی، ان کے اصنام و مجسمے تراشے تھے، اور ان کے نام پر ہیکل و معبد کی تعمیر کی تھی۔ ان اصنام کا اثر صرف وہم پرستوں تک محدود نہ تھا، بلکہ شعر و ادب میں بھی سرایت کر چکا تھا۔

اس وادی میں ہر شہر و دیار اور ہر زمانے کے بت جمع تھے، مصریوں کے دیوتا، تبع کے خدا، یمن کے آلہہ، جاہلیت کے معبود، وادی فرات کے پروردگار، وصل و فراق کی دیویاں، چاند سورج اور مشتری کے ہمنام اصنام سبھی اس محفل میں آگئے تھے سب کی شکلیں بھی مختلف تھیں اور قوموں کے ذوق صنم گری کا پتہ دیتی تھیں، کسی نے تلوار کھینچ رکھی تھی اور کسی نے سانپ کو گردن میں حمائل کر رکھا تھا۔ ہیئت کچھ بھی ہو حالت سب کی یکساں تھی یعنی سب کے سب اس "وحی محمدی" سے کانپ اور تھرا رہے تھے

جس نے ان کے خلاف انقلاب و بغاوت کو ہوا دی تھی اور ان کا عیش حرام کر دیا تھا جس نے اصنام کو بے دخل کر کے توحید کی اساس پر ایک نئی دنیا آباد کی تھی یہ تمام معبودان باطل ذکر جلیل سے خائف اور "ضرب خلیل" سے ناخوش تھے۔

شاعر کی اس ناگہانی زیارت کی "مردوخ" نے الہہ کو جب خوشخبری سنائی تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا "مردوخ" نے اسے اصنام کے حق میں فال نیک سمجھ کر ان سے کہنا شروع کیا" لو مبارک ہو! انسان پھر خدا سے بھاگ کر ادھر آیا ہے اور ادیانِ سماویہ کو ٹھکرا کر پھر سے ماضی کی خرافیات (MYTHOLORY) اور جاہلی روایات کی طرف علم و نظر کی وسعت، اور آثار قدیمہ کی تلاش اور ہماری عظمتوں کی دریافت کے لئے لوٹ رہا ہے، یہ یقیناً امید کی ایک کرن ہے جو مدت کے بعد ہمارے ویرانے میں چمکی اور وہ بادِ مراد ہے، جو ہماری محکوم سرزمین سے چلی ہے:۔

گفت مردوخ آدم از یزداں گریخت — از کلیسا و حرم نالاں گریخت

تا بیفزاید بادراک و نظر! — سوئے عہد رفتہ باز آید نگر!

روزگار افسانۂ دیگر کشاد، — می وزد زاں خاکداں باد مراد

فینقیوں اور کنعانیوں کے پرانے خدا البعل نے ہمیں سب سے پہلے خوش آمدید کہا اور خوشی میں گانے اور کہنے لگا۔

انسان نے آسمانوں کو بھی دیکھ لیا مگر خدا وہاں بھی نہیں ملا یہ اس کا ثبوت ہے کہ انسان جس خدائی مذہب کا دعوا کرتا ہے، وہ فریب تخیل سے زیادہ نہیں مذہب ایک خیال ہے، اِدھر آیا اُدھر گیا، جیسے دریا میں موجیں اٹھتی ہیں، اور پھر دوسرے ہی لمحے فنا ہو جاتی ہیں ——— انسان بغیر محسوس و مشہود خدا کے تسکین

نہیں پا سکتا ——— خدا فرنگ کو سلامت رکھے اس نے مشرقیوں کو خوب سمجھا اور علم و تحقیق و اکتشافات کے نام پر ہمیں ایک بار پھر زندہ کر دکھایا، دوستو اس سنہرے موقع کو غنیمت سمجھو جو مغرب کے سیاستدانوں نے ہمارے لئے فراہم کیا ہے۔

تم اس صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لو کہ اولادِ ابراہیم بھی عقیدۂ توحید بھلا بیٹھی اور میثاق ازل اور پیمانِ الست کو فراموش کر چکی اور اس کی لذت کھو بیٹھی، وہ فرنگ کے فیضِ صحبت سے اپنا سب کچھ لٹا چکی اور روح الامین کے آوردہ دین اور لذتِ ایمان و یقین کو یکسر حوالۂ نسیاں کر چکی۔

آدم آں نیلی تتق را بردرید   آں سوئے گردوں خدائے را ندید
در دلِ آدم بجز افکار چیست   ہمچو موج ایں سر کشید و آں رمید
جانش از محسوس می گیرد قرار   بو کہ عہدِ رفتہ باز آید پدید
زندہ باد افرنگئ مشرق شناس   آں کہ ما را از لحد بیروں کشید
در نگر آں حلقۂ وحدت شکست   آلِ ابراہیم بے ذوقِ الست
مرد حرا فتاد در بندِ جہات   با وطن پیوست و از یزداں گسست
خونِ او سرد از شکوہ دیریاں   لاجرم پیرِ حرم زنار بست
اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

ہبل کہتا ہے "وہ مومن آزاد جو حدود و قیود اور جہات کا کبھی قائل نہ تھا اور نہ خدائے خالقِ کائنات کے سوا کسی کو جانتا تھا، اب وطن سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ اسے پوجتا بھی ہے اس کے لئے لڑتا بھی ہے، لیکن خدا کو کبھی...... بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا۔

آج سارا عالم اسلام دانش فرنگ کا اسیر ہو چکا ہے، اور اس کے علاوہ علما شیوخ بھی تقلید مغرب پر اتر آئے ہیں، یہ ہمارے لئے سنہرا موقع اور ساعت سعید ہے، ہمیں آج خوشی منانے کا حق ہے کہ دین نے شکست کھائی اور قومیت و وطنیت کی فتح ہوئی اور محمد کے ایک چراغ کے لئے سیکڑوں بولہبی آندھیاں امنڈنے لگیں ہم "لا الٰہ الا اللہ" کی آواز سنتے ہیں، لیکن وہ دل کی آواز نہیں بلکہ حرف زیر لب سے آگے کچھ نہیں، اور جو دل میں نہیں ہوتا وہ زبان پر بھی زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا سحر فرنگ نے دنیا پر ایک بار پھر تاریکی کی حکومت مسلط کر رکھی ہے، اور دین کو بدحال بنا دیا ہے، ہمارے وہ پیر بہت اچھا کر رہے ہیں، جو دنیا چھوڑ کر خلوتوں اور غاروں میں جا بیٹھے ہیں۔ ہم نے اپنے بندوں کو مطلق تصرف اور کامل آزادی دی تھی اور طاعت و عبادت کے بوجھ سے انھیں سبکدوش رکھا تھا، ہم نے سنجیدہ عبادت کے بدلے گانے اور بھجن کو رواج دیا تھا، اور رقص و سرود کو بھی مقدس بنا دیا تھا، ہم اس بے مزہ نماز کے قائل نہ تھے جس میں نغمہ و موسیقی نہ ہو ہمارا اثر انسانوں پر اب تک باقی ہے، اور وہ غیر مشہود خدا پر موجود و مشہود بت کو ترجیح دیتے ہیں۔

در جہاں باز آمد ایام طرب	دیں ہزیمت خورد از ننگ و نسب
از چراغ مصطفےٰ اندیشہ چیست	زانکہ او را پف زند صد بولہب!
گرچہ می آید صدائے لا الٰہ،	آنچہ از دل رفت کے ماند بہ لب
اہرمن را زندہ کرد افسون غرب	روز یزداں زرد رو از بیم شب
بند دیں از گردنش باید کشود	بندۂ ما بندۂ آزاد بود!
تا صلوٰت او را گراں آید ہمی	رکعتے خواہیم و آں ہم بے سجود

جذبہ ہا از نغمہ می گردد بلند   پس چہ لذت در نمازِ بے سرود؟
از خداوندے کہ غیب او را سزد   خوشتر آں دیوے کہ آید در شہود
اے خدایانِ کہن وقت است وقت![1]



[1] جاوید نامہ ۱۰۳-۱۰۱

ایک لمحہ جمال الدین افغانی کے ساتھ

اقبال نے پیر رومی کے ساتھ اپنی فکری اور روحانی سیاحت میں ماضی کی عظیم شخصیات ارباب مذاہب و فلسفہ، اور سیاسی لیڈروں اور ادبی تحریکوں کے علمبرداروں سے ملاقاتیں کیں اور پھر اس اچھوتی وادی میں پہنچے جہاں آدمی کے قدم نہیں پہنچے تھے، اس میں فطرت کا جمال اپنی اصل و حقیقت کے ساتھ موجود تھا، پہاڑ اور میدان، چمن زار اور آبشار سب دل کو موہ رہے تھے شاعر کو تعجب ہوا کہ یہ دنیا رنگ و نور ہزاروں سال سے انسانی تمدن اور صنعتی سرگرمیوں سے خالی ہی چلی آرہی ہے۔

جمال فطرت فضا کی لطافت، آبشاروں کے ترنم و تکلم، اور وادی کی دلبری و رعنائی نے شاعر کو بہت متاثر کیا، اسی اثنا میں وہ اپنے شیخ رومی کی طرف متوجہ ہو کر دور سے آنے والی آواز اذاں پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ میرے کان غلط تو نہیں سن رہے ہیں، رومی ان سے تسلی دینے کے انداز میں کہتے ہیں کہ یہ تو صلحا اور اولیا ہی کی وادی ہے اور اس سے ہمارا ابھی قریبی رشتہ ہے، اس لئے کہ حضرت آدمؑ نے

جنت سے نکلنے کے بعد ایک دو دن یہیں قیام فرمایا تھا، اس سرزمین نے ان کی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی کی صدا سنی ہے، اس میں ان کے اشک ندامت جذب ہوئے ہیں، اسکی زیارت کے لئے بلند مقام لوگ اور فضیل و بوسعید، جنید و بایزید جیسے اولیا رہی ہمت کرتے ہیں آؤ ہم اس مقدس وادی میں وہ نماز شوق ادا کریں جس سے مادی دنیا میں اب تک محروم تھے۔

دونوں آگے بڑھتے ہیں، اور دو آدمیوں کو نماز پڑھتے دیکھتے ہیں، جس میں ایک افغانی ہے اور ایک ترک، امام جمال الدین افغانی ہیں، اور ان کے مقتدی سعید حلیم پاشا؟ رومی اقبال سے کہتے ہیں کہ مشرقی ماؤں نے ان دونوں سے بڑھ کر کسی کو نہیں جنا، ان کے فکر و نظر نے مشرقی سیاسیات کی کامیاب رہنمائی کی، لیکن خاص طور سے افغانی نے مشرق کے مرد بیمار میں روح نشاط پھونک دی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیداری کی لہر دوڑا دی، سعید حلیم پاشا قلب درد مند اور فکر ارجمند کے مالک تھے، ان کی روح جتنی بے تاب تھی اتنی ہی ان کی عقل روشن اور راہ یاب، ان کے پیچھے پڑھی ہوئیں دو رکعتیں عمروں کی عبادت و ریاضت سے بڑھ کر تھیں۔

سید جمال الدین نے سورۂ النجم پڑھی، زمان و مکان کی مناسبت، امام کی پرسوز شخصیت، قرآن کے جمال اور قرأت کی موزونیت نے سوز و اثر کی عجیب فضا پیدا کر دی جس میں آنکھیں اشکبار اور دل بیقرار ہو اٹھے، یہ مسحور کن قرأت اگر حضرت ابراہیمؑ و جبرئیلؑ بھی سنتے تو لطف اندوز ہوتے اور اس کی داد دیتے، ان کی آواز میں وہ تاثیر تھی کہ مردے جی اٹھیں قبروں سے "الا اللہ" کے نعرے بلند ہونے لگیں اور حضرت داؤدؑ بھی سوز و مستی کا پیغام سنیں، یہ قرأت ہر پردگی کو آشکارا اور اسرار کتاب کو بے حجاب کر رہی تھی

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے نماز کے بعد ادب و محبت سے ان کے ہاتھ چومے اور رومی نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ سیلانی کسی منزل پر ٹھہرتا ہی نہیں اور دل میں تمناؤں کی ایک دنیا لئے پھرا کرتا ہے، یہ مرد آزاد اپنے سوا کسی کا قائل نہیں، قلندری و بے باکی اس کا پیشہ اور اس کی زندگی ہے ہیں اسی لئے اسے "زندہ رود" کہتا ہوں۔

افغانی ان سے خاکدانِ عالم کے احوال پوچھتے ہیں، اور خاک نژاد لیکن نوریں نہاد۔ مسلمانوں ـــــ کے بارے میں بیتابی سے سوال کرتے ہیں، میں نے کہا کہ سیدی! یہ امت جو تسخیر کائنات کے لئے اٹھی تھی اب دین و وطن کی کشمکش میں مبتلا ہے اب ایمان کی طاقت اور روح کی قوت اس میں باقی نہیں اور دین کی عالمگیری پر بھی اسے چنداں اعتبار نہیں اس لئے قومیت و وطنیت کے سہارے لے رہی ہے ترک و ایرانی مئے فرنگ سے مخمور اور اس کے مکروفریب سے شکستہ و رنجور ہیں، اور مغربی قیادت نے مشرق کو زار و نزار بنا دیا ہے، اور دوسری طرف اشتراکیت دین و ملت کی عزت سے کھیل رہی ہے ۔ــ

روح در تن مردہ از ضعفِ یقیں ــــ نا امید از قوتِ دینِ مبیں
ترک و ایران و عرب مستِ فرنگ ــــ ہر کسے را در گلو شستِ فرنگ
مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب ــــ اشتراک از دین و ملت بردہ تاب

افغانی نے یہ سب صبر و سکون لیکن حزن و الم کے ساتھ سنا اور وہ پھر یوں گویا ہوئے "عیار فرنگ نے اہل دین کو قوم و وطن کی پٹی پڑھائی وہ اپنے لئے تو ہمیشہ نئے مرکز اور نو آبادیات کی فکر میں رہتا ہے لیکن تم میں پھوٹ ڈالے رہنا چاہتا ہے، اس لئے تمہیں

ان حدود سے نکل کر آفاقی اور عالمی رول ادا کرنا چاہئے، مسلمان کو ہر ملک کو اپنا وطن اور ہر زمین کو اپنا گھر سمجھنا چاہئے، اگر تم میں شعور ہے تو تمہیں جہانِ سنگ وخشت سے بلند ہو کر سوچنا ہوگا۔ دین انسان کو مادیات سے اٹھا کر اسے عرفان نفس سکھاتا ہے جو انسان "اللہ" کو پالیتا ہے وہ پوری دنیا میں بھی نہیں سما سکتا اور کائنات بھی اسے تنگ محسوس ہوتی ہے، گھاس پھوس مٹی سے نکلتے ہیں، اور مٹی ہی میں فنا ہو جاتے ہیں لیکن عظمت انسانیت کا یہ انجام نہیں، آدم خاکی ہے، لیکن اس کی روح افلاکی ہے انسان کا ظاہر زمین کی طرف مائل ہے، لیکن اس کا اندروں کسی اور ہی عالم کا قائل ہے، روح مادی پابندیوں سے گھبراتی ہے، اور حدود وقیود سے ناآشنا ہی رہتی ہے، جب اسے وطنیت کی مٹی میں بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا دم گھٹنے اور اس کی سانس رکنے لگتی ہے — شاہین وشہباز پنجروں میں کیا آشیانوں میں بھی کبھی رہنا گوارا نہیں کرتے۔

یہ مشتِ خاک جسے ہم وطن کہتے اور مصر و شام وعراق و یمن کا نام دیتے ہیں، ان کے درمیان یقیناً یہ رشتہ ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ یہیں تک بند ہو کر رہ جائیں اور آنکھیں کھول کر دنیا کو نہ دیکھیں، سورج، مشرق سے نکلتا ہے، لیکن وہ شرق وغرب دونوں کو منور اور مسخر کرکے رہتا ہے، اس کی فطرت حدود سے بے نیاز ہے، اگرچہ اس کا طلوع وغروب حدود کے اندر ہی ہوتا ہے۔

چیست دیں برخاستن از روئے خاک   تا زخود آگاہ گردد جانِ پاک
می نگنجد آنکہ گفت اللہ ہو   در حدودِ ایں نظامِ چارسو
گفت تن در شو بخاک رہ گذر   گفت جاں پہنائے عالم را نگر

جان نگنجد در حیات اے ہوشمند | مرد حر بیگانہ از ہر قید و بند
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب | با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
فطرتش از مشرق و مغرب بری ست | گرچہ او از روئے نسبت خاوری ست

افغانی نے مزید فرمایا کہ اشتراکیت اس یہودی کی دماغی اپج ہے جس نے حق و باطل کو خلط ملط کر دیا ہے جس کا دماغ کافر لیکن دل مومن تھا، یہ مغرب کا المیہ ہے کہ اس نے روحانی قدریں اور غیبی حقائق کھو کر انھیں معدہ اور مادہ میں تلاش کرنا چاہا حالانکہ روح کی قوت و حیات کا تعلق جسم سے نہیں لیکن شیوعیت بطن و معدہ اور تن و شکم سے آگے بڑھتی ہی نہیں مارکس (KARL MARX) کا یہ مذہب مساواتِ شکم پر قائم ہے، حالانکہ انسانی اخوت جسمانی مساوات پر نہیں بلکہ ہمدردی و مواسات اور محبت و مروت پر تعمیر ہوتی ہے:۔

غربیاں گم کردہ اند افلاک را | در شکم جویند جانِ پاک را!
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک | جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس | بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است | بیخ او در دل نہ در آب و گل است

افغانی نے ملوکیت کے بارے میں فرمایا ملوکیت کا جسم و ظاہر بہت خوشنما ہے لیکن اس کا دل تاریک اور روح نحیف و نزار اور اس کا ضمیر بالکل مردہ ہے، وہ شہد کی مکھی کی طرح ہر پھول پر بیٹھتی ہے، اور اس کا رس چوس لیتی ہے، اس سے پھولوں کے رنگ میں فرق نہیں آتا لیکن ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے، اور وہ کاغذی پھول بن کر رہ جاتے ہیں، ملوکیت بھی اسی طرح افراد و اقوام کو اپنا شکار بناتی اور ان کا

خون چوس کر ہڈی چمڑا چھوڑ دیتی ہے ــــــ ملوکیت اور اشتراکیت کے لئے حرص وہوس، خدا بیزاری اور مردم آزاری، قدر مشترک اور (COMMON FACTOR) کی حیثیت رکھتی ہیں، زندگی اگر اشتراکیت میں "خروج" ہے، تو ملوکیت میں "خراج" اور انسان ان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پارۂ زجاج! اشتراکیت علم وفن اور مذہب کی قائل ہے، تو ملوکیت عوام کی دشمن، مادیت دونوں کا مشترکہ مذہب ہے، دونوں کا ظاہر معصوم لیکن باطن مجرم ہے۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب ــــ ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج ــــ درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بعلم و دین و فن آرد شکست ــــ آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ــــ ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن ــــ در گلے تخم دلے انداختن!

افغانی کہتے ہیں کہ قرآن کی تعلیمات دوسری ہیں اور مسلمانوں کا عمل دوسرا ہے ان کی زندگی کا شرارہ بجھ چکا اور ان کا حضورؐ سے تعلق ختم ہو چکا ہے، آج مسلمان اپنی زندگی اور معاشرے کی اساس قرآنی ہدایات پر نہیں رکھتا اس کے نتیجے میں وہ دین و دنیا دونوں میں پسماندہ رہ گیا ہے، اس نے قیصر و کسریٰ کا نظام استبداد توڑ دیا لیکن خود ملوکیت کا علمبردار بن گیا اور عجمی سیاسیات کو اپنا لیا اور زندگی کا نقطۂ نظر ہی بدل ڈالا:۔

در دل او آتش سوزندہ نیست ــــ مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست،
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد ــــ در ایاغ او نہ مے دیدم نہ دُرد!

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست　　خود سر تخت ملوکیت نشست

افغانی ملت روسیہ کو پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم نے بھی مسلمانوں کی طرح قیصر و کسریٰ کا نظام ختم کیا ہے تمہیں مسلمانوں سے عبرت لینا چاہیئے، اور زندگی کے معرکے میں عزم و ثبات سے قائم رہنا، اور ملوکیت و وطنیت کے اصنام کو شکستہ کرنے کے بعد انھیں اب بھولے سے بھی یاد نہیں کرنا چاہیئے، آج دنیا کو اس امت کی ضرورت ہے جو وعدہ و وعید، رحمت و شدت، نرمی و گرمی دونوں رکھتی ہو، تم مشرق سے روحانیت و مذہبیت لو کیونکہ مغربی مذہب پرستی کھوکھلی ہو چکی ہے، اب ان گڑے مردوں کو ہرگز مت اکھیڑنا، تم نے خدایانِ باطل کا انکار کر کے مرحلۂ نفی طے کر لیا ہے، اب الا اللہ کی اثباتی مہم بھی تمہیں سرانجام دینا چاہیئے اس طرح تمہارا کارنامہ مکمل اور سفر تمام ہو سکے گا، تمہیں عالمی نظام کی فکر ہے تو اس کے لئے پہلے محکم اساس تلاش کرو اور وہ اساس دین و عقیدہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

تم نے خرافیاتِ عالم کی سطر سطر مٹا دی ہے، اس لئے تمہیں اب قرآن کا حرف حرف پڑھنا چاہیئے، تمہیں معلوم ہو گا کہ قرآن ملوکیت و آمریت کا جانی دشمن اور سرمایہ داری کی موت ہے، اور غلاموں، مزدوروں اور مجبوروں کے لئے زندگی، وہ ضرورت سے زائد سرمایہ کو غریبوں پر خرچ کرنے کی تاکید کرتا ہے، وہ سود کو حرام اور تجارت کو حلال کرتا اور قرضِ حسنہ اور صدقۂ جاریہ پر لوگوں کو ابھارتا ہے، کیا دنیا کے فتنوں اور بے رحمیوں کا سرچشمہ سود نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ زمین سے نفع حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن ملکیت خدا کی ہے، اس لئے وہ امین اور وارث ہے، مالک مطلق نہیں (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه) بادشاہوں نے حق کا علم سرنگوں کر دیا اور

خدا کی دنیا ان سے پامال ہو گئی ہے، قرآن حق و صداقت کی آواز بلند کرتا اور کہتا ہے کہ ابن آدم کے لئے زمین ایک وسیع دسترخوان ہے، اور کل نوع انسانی ایک خاندان (ماخلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ) اسی لئے جب قرآنی حکومت قائم ہوئی تو غلو پسند راہب اور سنیاسی چھپ گئے اور پاپائیت اور کلیسا کا طلسم ٹوٹ گیا قرآن صرف ایک کتاب ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بہت کچھ ہے، وہ انسان کو بدلتا ہے اور پھر کائنات کو بدل دیتا ہے یہ وہ زندہ کتاب ہدایت و سعادت ہے، جو قلب کائنات کی دھڑکن اور مشرق و مغرب کا ضامن ہے، اس سے مشرق و مغرب دونوں ہی کی تقدیر بندھی ہوئی اور انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔

تم نے نیا قانون و آئین بنایا ہے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ دنیا پر ذرا قرآن کی روشنی میں بھی ایک نظر ڈال کر دیکھو کہ زندگی کی حقیقت سمجھ سکو:۔

با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد؟ | مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد؟
جز بقرآں ضیغمی روباہی است | فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر | فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر
چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ | دستگیر بندۂ بے ساز و برگ
رزق خود را از زمیں بردن رواست | ایں متاع بندہ و ملک خداست
نقش قرآں تا دریں عالم نشست | نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است | ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود | جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود
مثل حق پنہاں و ہم پیداست ایں | زندہ و پائندہ و گویاست ایں

اندرو تقدیرہائے غرب و شرق　　سرعت اندیشہ پیدا کن چوں برق

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ　　ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ!

آفریدی شرع و آئینے دگر!　　اندکے با نورِ قرآنش نگر!

از بم و زیر حیات آگہ شوی

ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی[1]



[1] جاوید نامہ ۹۱-۶۳

اقبال درِ دولت پر[1]

ڈاکٹر محمد اقبال کی پوری زندگی عشق رسول ؐ اور یاد مدینہ سے معمور تھی، ان کا زندہ جاوید کلام ان دونوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے، لیکن زندگی کے آخری ایام میں یہ پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینہ کا نام آتے ہی اشک محبت بے ساختہ جاری ہو جاتے تھے وہ اپنے اس کمزور جسم کے ساتھ یقیناً مدینۃ الرسول میں حاضر نہ ہو سکے لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل، نیز اپنی قوت تخیل اور زور کلام کے ساتھ انھوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائرِ فکر ہمیشہ اسی آشیانہ یا آستانہ پر منڈلاتا رہا۔

انھوں نے رسول اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اپنے دل، اپنی محبت، اپنے اخلاص اور اپنی وفا کی نذر پیش کی اور آپ کو مخاطب کر کے اپنے جذبات و احساسات

---

[1] یہ اس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو "اقبال فی مدینۃ الرسول" کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں دمشق ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی تھی، ترجمہ مولوی محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے قلم سے ہے۔

اپنی ملت اوراپنے معاشرہ کی دل گداز تصویر کھینچ کررکھ دی، ایسے مواقع پران کی شاعری کے جوہر خوب کھلتے تھے۔اور معانی کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے، وہ حقائق جن کی زمام مضبوطی سے انھوں نے گرفت میں رکھی تھی اس وقت بے حجاب وبے نقاب ہوکر سامنے آتے اوراپنا خوب رنگ دکھلاتے۔

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

اس موضوع پران کا کلام سب سے زیادہ جاندار، طاقتور، مؤثران کے جذبات کا صحیح ترجمان، ان کے تجربات کا نچوڑ، ان کے عہد کی تصویراوران کے نازک ترین احساسات کا آئینہ دار ہے۔

آگے ان کے جو اشعار پیش کئے جائیں گے ان میں انھوں نے عالم خیال میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیاہے اوراس تصور کے ساتھ وہ قافلۂ شوق کے ہمراہ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں، ذوق حضوری اور شوق ومحبت میں یہ ریت ان کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہورہی ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ذرہ دل بن کر دھڑک رہا ہے، وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اورنرم روی اختیار کرے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خنداست　　شبش کوتاہ وروزاو بلند است
قدم اے راہ رو آہستہ ترنہ　　چوما ہر ذرۂ او دردمند است

حدی خواں کا نغمہ سن کران کی آتش شوق اور تیز ہونے لگتی ہے، دل کی جراحتیں تازہ ہوجاتی ہیں، ان کے پورے وجود میں حرارت اور زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے

اور ان کا سازِ دل درد و اثر میں ڈوبے ہوئے موثر اور بلیغ اشعار کے ساتھ نغمہ زن ہونے لگتا ہے۔

پھر وہ اسی عالم تصور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مواجہ شریف میں حاضر ہوتے ہیں، درود وسلام پڑھتے ہیں، محبت و شوق کی زبان ان کے دل کی ترجمان بن جاتی ہے اور وہ اس مبارک و قیمتی ساعت سے فائدہ اٹھا کر اپنا حالِ دل بیان کرتے ہیں، امت اسلامیہ اور عالم اسلام کے حالات، اس کے مسائل اور مشکلات اس کی آزمائشیں اور امتحانات، نیز مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے اس کی سپر افگنی اور بے بسی، اپنے وطن میں اس کی غریب الوطنی اور خود اپنی قوم میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں، کبھی ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور کبھی دل کی بات زبان پر آجاتی ہے۔

اس مجموعہ اشعار کا نام انھوں نے "ارمغان حجاز" رکھا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ پورے عالم اسلام کے لئے بہت مبارک تحفہ اور نسیم حجاز کا ایک مشکبار جھونکا ہے،

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رُخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

اقبال کا یہ روحانی سفر اس زمانہ میں ہوا جب ان کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی، اور ان کے قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اس سن میں جب لوگ آرام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، اور گوشہ نشینی پسند کرتے ہیں، ان کو جس چیز نے اس طویل و پر مشقت سفر پر آمادہ کیا اس کو فرمانِ محبت کی تعمیل اور مقصد زندگی کی تکمیل کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

بایں پیری رہ یثرب گرفتم نواخواں از سرود عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

وہ کہتے ہیں کہ اس وقت جب کہ میری زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے اگر میں نے مدینہ منورہ کا (جو روح کا اصل مسکن اور مومن کا حقیقی نشیمن ہے) قصد کیا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے، جس طرح شام کے وقت چڑیاں اپنے اپنے آشیانہ کی طرف جاتی ہیں، اسی طرح میری روح بھی اب اپنے حقیقی آشیانہ کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جب ان کی اونٹنی اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ سوار بہت خستہ و بیمار ہے، لیکن ناقہ ان کے اس مشورہ کو قبول نہیں کرتا وہ ایسا مستانہ وار قدم رکھتا ہے، گویا یہ ریگ زار نہیں بلکہ ریشم کا ایک فرش بچھا ہوا ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی بپایش ریگ ایں صحرا حریر است

اب یہ کاروانِ مدینہ درود و سلام کی سوغات لئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اس پُرکیف فضا میں وہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو اس گرم ریت پر ایک ایسا سجدہ میسر ہو جو ان کی پیشانی کے لئے نقشِ دوام بن جائے، وہ اپنے دوستوں کو بھی اسی سجدۂ شوق کا مشورہ دیتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ در وے کاروانہا درودے خواند و محمل براند
بہ ریگِ گرم او آور سجودے جبیں را سوز تا داغے بماند

ذوق و شوق کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے تو عراقی اور جامی کے اشعار بےساختہ ان کی زبان پر جاری ہوجاتے ہیں، لوگ حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ عجمی آخر کس زبان میں اشعار پڑھ رہا ہے، جو سمجھ میں تو نہیں آتے لیکن دل کو درد و محبت سے اس طرح بھر دیتے ہیں کہ آدمی کو کھانے پینے کا بھی ہوش باقی نہیں رہتا اور پانی کے بغیر بھی اس کی تشنگی دور اور خستگی کافور ہوجاتی ہے۔

امیر کارواں آں عجمی کیست　　　سرود او بآہنگ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابیِ او　　　خنک دل در بیابانے تواں زیست

راستہ کی دشواریوں اور مشقتوں میں ان کو لطف آنے لگتا ہے، شب بیداری کم خوابی اور بے آرامی سے سرور حاصل ہوتا ہے، وہ اس راستہ کو طویل نہیں سمجھتے اور جلد پہنچنے کی آرزو نہیں کرتے بلکہ اپنے ساربان سے اس کی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس سے بھی زیادہ دور دراز راستہ سے لے چلے تاکہ اس بہانہ سے ذوق و شوق کی مدت بھی کچھ دراز ہوسکے اور انتظار کا لطف (جو عشاق کا زادِ سفر اور محبین کا سرورِ نظر سمجھا گیا ہے) دوبالا ہوسکے۔

غم راہی نشاط آمیز تر کن　　　فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے سارباں راہِ درازے　　　مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

اسی سرور و شوق اور کیف و مستی کے ساتھ وہ سارا راستہ طے کرتے ہوئے مدینۂ طیبہ پہنچتے ہیں، اور اپنے رفیق سفر سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی زلف کے اسیر ہیں، آج ہم کو اپنے دل کی مراد برلانے اور اپنے آقا اور محبوب کے قدموں پر اپنی پلکیں بچھانے کا موقع ملا ہے، اس لئے آج ہمیں اپنی آنکھوں پر سے پابندی

ہٹا لینی چاہیئے، اور اس سیلاب اشک کو جو عرصے سے امنڈنے کے لئے بے چین ہے، تھوڑی دیر کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم　　من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم　　بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

وہ اپنے اوپر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ کیا خوش نصیبی اور مقام مسرت ہے کہ یہ سعادت اور نعمت ان کے نصیب میں آئی۔ اور اس گدا کو اپنی نااہلی کے باوجود اس دربار شاہی میں نوازا گیا جہاں بڑے بڑے دانشوروں اور اورنگ نشینوں کو توفیق باریابی حاصل نہ ہوسکی۔

حکیماں را بہا کمتر نہادند　　بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے　　در سلطاں بہ درویشے کشادند

لیکن اس سرور و مستی اور جذب و شوق میں بھی وہ امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ کو فراموش نہیں کرتے اور پوری صدق بیانی اور قادر الکلامی کے ساتھ اس کا حال کتاب کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

مسلماں آں فقیر کج کلاہے　　رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد چرا نالد نداند　　نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

وہ کہتے ہیں کہ اس امت کی بڑی آزمائش یہ ہے کہ یہ بام بلند سے گری ہے اور جو جتنے اوپر سے گرتا ہے، اتنی ہی اس کو چوٹ آتی ہے۔

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے　　مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا　　کہ افتاد است از بام بلندے

وہ کہتے ہیں کہ اس امت کی پریشاں روزگاری اور اس کی بے نظمی و بدحالی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت ہے اور امام نہیں، افراد ہیں مگر کوئی نظام نہیں۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است　　ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکار بے نظام او چہ گویم　　تو می دانی کہ ملت بے امام است

وہ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں اب وہ "تب و تاب" اور اس کے اندر وہ نمو خیزی کی صلاحیت باقی نہیں رہی جو اس کا طرۂ امتیاز تھا، اب عرصہ سے اس کی نیام بے شمشیر اور اس کی "کشت ویران" لالہ و گل سے محروم ہے۔

نماند آں تاب و تب در خون نابش　　نروید لالہ از کشت خرابش
نیام او تہی چوں کیسۂ او　　بطاق خانہ ویراں کتابش

وہ کہتے ہیں کہ یہ امت اپنے سرمایہ آرزو اور ذوقِ جستجو سے محروم ہو کر رنگ و بو میں گرفتار ہو گئی ہے، اس کے کان نرم و نازک نغموں کے خوگر ہو گئے ہیں اور مردانِ حُر کی آواز اس کے لئے نامانوس ہو چکی ہے۔

دلِ خود را اسیر رنگ و بو کرد　　تہی از ذوق و شوق آرزو کرد
صفیر شاہبازاں کم شناسد　　کہ گوشش با طنین پشہ خو کرد

اب نہ... اس کی آنکھ میں یقین کا نور اور عشق کا سرور ہے نہ اس کا دل کسی کی محبت میں مخمور، اس کا سینہ کسی کی یاد سے معمور ہے، وہ حضوری سے بہت دور اور منزلِ مقصود سے ناآشنا اور مہجور ہے۔

بچشم او نہ نور و نے سرور است　　نہ دل در سینۂ او ناصبور است
خدا ایں امتے را یار بادا　　کہ مرگِ او ز جانِ بے حضور است

پھر وہ اس کے شاندار ماضی کا موازنہ (جب اس پر لطف وعنایت کی نظر خاص تھی) اس داغ دار حال سے کرتے ہیں، وہ بڑی بلاغت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس کو آپ نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا اور ناز ونعم میں رکھا تھا وہ آج ان صحراؤں میں اپنا رزق تلاش کرنے اور دربدر بھٹکنے پر مجبور ہے۔

مپرس از من کہ احوالش چنان است　　زمینش بدگہر چوں آسمان است

برآں مرغے کہ پروردی بانجیر　　تلاش دانہ درصحرا گران است

وہ لادینیت کے اس طوفان بلاخیز کا ذکر کرتے ہیں، جو عالم اسلام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے، ڈاکٹر محمد اقبال (جو خود فلسفہ سیاسیات اور اقتصادیات کے غواص تھے اور اس کا کوچہ کوچہ ان کا دیکھا ہوا تھا) اچھی طرح سمجھتے تھے کہ عالم اسلام میں لادینیت کا سب سے بڑا راستہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر "روحانی خلا" اور "قلب کی برودت" ہے مسرفانہ اور استقراطی زندگی سے اس میں اور مدد مل رہی ہے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ لادینیت کے اس سیلاب اور مادہ پرستانہ معاشی فلسفہ کا مقابلہ اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ زہد اور محبت ہے، اس پر اگر کوئی چیز غالب آسکتی ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زاہدانہ اور عاشقانہ زندگی ہے، وہ مسلمانوں کے لئے اس مثالی زندگی کی آرزو کرتے ہیں، جو زندگی کے ہر شعبہ پر اثرانداز ہو، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایسی زندگی وجود میں آجائے تو ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکانے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوگی۔

دگرگوں کرد لادینی جہاں را　　زآثار بدن گفتند جاں را

ازاں فقرے کہ باصدیق دادی　　بشورے آور ایں آسودہ جاں را

وہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب فقروافلاس اور مادی وسائل کی کمی کو نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ اس کی توجیہ اس "شعلۂ زندگی" کی افسردگی سے کرتے ہیں، جو کسی عہد میں ان کے سینہ کے اندر فروزاں تھا۔

وہ کہتے ہیں، جب یہ درویش اور فقیر ایک اللہ کے لئے سجدہ ریز تھے اور کسی اور کا اقتدار اور اختیار تسلیم نہیں کرتے تھے، اس وقت شہنشاہوں کا گریبان ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن جب یہ شعلہ سرد ہوگیا تو ان کو درگاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لینی پڑی۔

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند گریبان شہنشاہاں دریدند
چو آں آتش درون سینہ افسرد مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

وہ مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں، اور اس کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھتے ہیں، اس میں ان کو جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے ایک مسلمان کا سر شرم و ندامت سے جھک جائے، بہت سی ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کو نبوت محمدی، اسکی تعلیمات اور اس کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں، ان کو بہت سی مشرکانہ باتیں، غیر اللہ کی پرستش، جابر و ظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی مدح سرائی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں، جن سے ایک غیور اور خوددار انسان کی پیشانی عرق آلود ہونے لگتی ہے، اقبال خاموشی کے ساتھ ایک ایک چیز دیکھتے جاتے ہیں، اور آخر میں بڑی صراحت اور اعتراف ــــــ لیکن بڑی بلاغت اور اختصار کے ساتھ کہتے ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان پستیوں کے ساتھ ہم ہرگز آپ کے شایان شان نہ تھے، ہمارا انتساب آپ کی طرف آپکی شان میں کھلی

بے ادبی ہے۔

نہ نالم از کسے می نالم از خویش
کہ ما شایان شانِ تو نبودیم

وہ عالم اسلام پر جوان کا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا ہے' احتیاطاً دوبارہ ایک نظر ڈالتے ہیں، اور اپنے جائزہ کا حاصل یہ بتلاتے ہیں کہ ایک طرف خانقاہوں کا سبو خالی ہے، دوسری طرف دانش گاہیں، جدت وجرأت سے عاری ہیں، ان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ طے کئے ہوئے سفر کو بار بار طے کرتی رہیں، ادب و شاعری مردہ و بے روح اور دلی جذبات سے محروم ہیں۔

سبوئے خانقاہاں خالی از مے | کند مکتب رہِ طے کردہ را طے
زبزم شاعراں افسردہ رفتم | نوا ہا مردہ بیروں افتد از نے

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دنیائے اسلام کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ مسلمان مجھے نہ ملا جو موت سے لرزہ براندام ہونے کے بجائے موت اس سے لرزہ براندام ہو اور جو خود موت کے لئے پیام موت ہو۔

بآں بالے کہ بخشیدی پریدم | بسوز نغمہائے خود تپیدم
مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد | جہاں گردیدم و او را ندیدم

وہ مسلمانوں کی پریشاں خاطری، آشفتہ سری اور آوارہ گردی کا راز فاش کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ ہر وہ فرد یا جماعت جو دل تو رکھتی ہے لیکن دلبر نہیں رکھتی ہے، محبت رکھتی ہے، لیکن محبوب سے ناآشنا ہے، وہ دلجمعی اور اطمینان سے ہمیشہ محروم رہتی ہے، اس کی تمام قوتیں ضائع ہوتی ہیں، اور اس کی جد و جہد کبھی ایک منزل اور

ایک مرکز پر قائم نہیں رہتی۔

شبے پیش خدا بگریستم زار | مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم | دلے دارند و محبوبے ندارند

لیکن ان تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود وہ مسلمانوں سے بددل اور خدا کی رحمت سے مایوس نہیں، بلکہ اس مایوسی، دوسروں پر اعتماد کرنے اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرنے والوں پر سخت تنقید کرتے ہیں، اور بڑے درد سے کہتے ہیں کہ حرم کے نگہبان بت خانہ کے پاسبان بن بیٹھے ہیں، ان کا یقین مردہ و مضمحل اور ان کی نگاہ مستعار اور رہین منت اغیار ہے۔

نگہبان حرم معمار دیر است | یقینش مردہ و چشمش بغیر است
ز انداز نگاہ او تواں دید | کہ نومید از ہمہ اسباب خیر است

وہ کہتے ہیں کہ مسلمان اگرچہ بے خیل و سپاہ ہیں، لیکن ان کا ظرف بادشاہوں سے زیادہ عالی اور نگاہ سلاطین سے زیادہ بلند ہے، اگر تھوڑی دیر کے لئے ان کو ان کا مقام دے دیا جائے تو ان کا یہ جمال جہاں افروز جلال عالم گیر کا منظر بھی پیش کر سکتا ہے۔

مسلماں گرچہ بے خیل و سپاہ است | ضمیر او ضمیر بادشاہ است
اگر او را مقامش باز بخشند | جمال او جلال بے پناہ است

وہ اپنا اور اس عصر کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ برسرپیکار ہیں، اور جو قدم قدم پر ان کے لئے ایک مستقل آزمائش اور امتحان ہے۔

گہے رفتم کہنے مستانہ خیزم | چہ خوں بے تیغ و بے شمشیر ریزم

نگاہ التفاتے بر سرِ بام — کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی عصر جدید سے کشمکش میں گزری انھوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفہ کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس پر آگے بڑھ کر سخت تنقید کی، اس کو چیلنج کیا، اور بڑی جرأت، روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اسکو کھوٹا ثابت کیا اور اس پردۂ فریب کو چاک کیا جس نے اس کی اصلی اور مکروہ شکل کو نگاہوں سے چھپا رکھا تھا، وہ حقیقت میں نئی نسل کے مربی، یقین وخود اعتمادی، نیز اپنی اور اسلامی شخصیت کے مکمل شعور کے حامل اور مادی بنیادوں اور مادی طرزِ فکر کے زبردست منکر تھے، اور ان کو یہ کہنے کا حق حاصل تھا۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من — ازو آموختم اسرارِ جاں من
بدورِ فتنۂ عصرِ کہن اُو — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

وہ مغربی علوم سے اپنی بغاوت، اس کے جال سے بچ نکلنے اور اپنے عقیدہ وایمان اور خصوصیات کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے بڑا قلندرانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے مغربی فلسفہ وتہذیب کے آتش نمرود میں شانِ ابراہیمی کا مظاہرہ کیا، وہ فخر ومسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان علوم کے مغز کو حاصل کر لیا پوست کو پھینک دیا اور یہی نہیں بلکہ کامیابی کے ساتھ اس کے جال سے باہر بھی آگئے اور اس کے طلسم ہوشربا کو پاش پاش کر دیا جس نے مشرق ومغرب دونوں کی نظربندی کر رکھی ہے۔

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم — بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم

وہ اپنی اس زندگی کا ذکر کرتے ہیں، جو یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں گزری تھی، اور جہاں خشک و افسردہ کتابوں، دقیق فلسفیانہ مباحث، جمال فتنہ انگیز اور دل آویز و خوشنما مناظر کے سوا انھیں اور کچھ نہ مل سکا، اگر کوئی چیز ملی تو وہ خود فراموشی تھی، جس نے ان کو ان کے وجود سے بھی محروم کر دینا چاہا۔

بہ افرنگی بتاں دل باختم من — زتاب دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتن بیگانہ بودم — چو دیدم خویش را نشناختم من

اب بھی جب ان کو ان دنوں کی ویرانی و بے نوری یاد آتی ہے، ان کی طبیعت پر وحشت و انقباض طاری ہو جاتا ہے۔

وہ بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں کہ میخانۂ مغرب میں بیٹھ کر مجھے سوائے دردِ سر کے اور کچھ نہ ملا، اس سے زیادہ بے سوز، بے نور اور بے کیف شب و روز مجھے اپنی پوری عمر میں یاد نہیں جو ان دانشمندانِ فرنگ کے ساتھ گزرے۔

مے از میخانۂ مغرب چشیدم — بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی — ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں میں تو آپ کے ایک فیضِ نگاہ کا پروردہ ہوں "اہل دانش" اور "اہل خرد" کی یہ ساری نکتہ آفرینیاں اور لن ترانیاں میرے لئے دردِ سر کا سامان اور وبالِ جان ہیں، میں تو صرف آپ کے در کا فقیر ہوں آپ کی گلی کا سائل ہوں مجھے کسی کے سنگ آستاں پر سر پھوڑنے اور قسمت آزمانے کی کیا ضرورت؟

فقیرم از تو خواہم ہر چہ خواہم — دل کوہے خراش از برگ کاہم
مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد — کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

پھر وہ اس طبقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو علم دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے وہ اس کی خشکی، جمود، محبت اور سوز درد دل سے محرومی، معلومات کی گرم بازاری اور اصطلاحات کی گراں باری کا شکوہ کرتے ہوئے بڑے شاعرانہ اور بلیغ انداز میں کہتے ہیں کہ اس کا صحرائے حجاز زمزم سے خالی اور بیت اللہ سے محروم ہے، وہ کہتے ہیں کہ حجاز کے ریگستان کی قیمت تو بیت اللہ اور آب زمزم سے ہے، اگر یہ نہ ہوں تو ان تپتے ہوئے بیابانوں اور خاموش پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ اسی طرح وہ عالم دین کتنا مفلس اور نادار ہے، جو علم وافر، زبان گہر افشاں اور ذہن رسا کا مالک ہے لیکن اس کی آنکھ محبت کے ایک آنسو اور دل کی ایک تڑپ سے بھی نا آشنا ہے، جس کے حصہ میں اس سرزمین مقدس کی صرف سختی اور گرمی آئی ہے، خنکی اور نمی نہیں آئی۔

دلِ ملّا گرفتارِ غمے نیست　　　نگاہے ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتب او　　　کہ در ریگ حجازش زمزمے نیست

وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار غیر اللہ پر بھروسہ کیا اور اس کی سزا میں دو سو بار اپنے مقام سے نیچے گرایا گیا، یہ وہ جگہ ہے جہاں زورِ شمشیر اور حسنِ تدبیر کام نہیں آتا، یہ تقدیر الٰہی اور مشیت ایزدی کا مقام ہے، اور اس میں ایک لغزش قدم آدمی کو بہت نیچے گرا سکتی ہے۔

دلِ خود را بدستِ کس ندادم　　　گرہ از روئے کارِ خود کشادم
بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار　　　دو صد بار از مقامِ خود فتادم

وہ کہتے ہیں کہ اس بے اخلاص و بے سوز عہد میں جو منفعت و مصلحت کے سوا

کسی اور چیز سے آشنا نہیں، اور جس کا مصنوعی یا حیوانی دل ہر قسم کے لطیف احساسات اور مخلصانہ جذبات سے عاری ہے، میرے لئے سوز دروں کی آگ میں جلنے اور خونِ جگر پینے کے سوا اور کیا ہے۔

نگاہم زانچہ بینم بے نیاز است دل از سوزِ درونم در گداز است
من و ایں عصرِ بے اخلاصِ بے سوز بگو با من کہ آخر ایں چہ راز است

وہ کہتے ہیں مشرق و مغرب کسی جگہ میرا کوئی ہمدم و ہمراز نہیں ہیں اپنا غمِ دل خود اپنے ہی دل سے کہتا ہوں اور اپنے کو بہلاتا ہوں۔

من اندر مشرق و مغرب غریبم کہ از یاران محرم بے نصیبم
غمِ خود را بگویم با دلِ خویش چہ معصومانہ غربت را فریبم

ان کو اس کی شکایت ہے کہ ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور مشوروں پر کسی نے عمل نہیں کیا اور ان کے نخلِ علم کا کسی نے پھل نہ کھایا، انھوں نے شاعری میں جس سروشِ غیب کی ترجمانی کی اس پر کسی نے کان نہ دھرا، سب ان کو ترجمانِ حقیقت کے بجائے محض غزل خواں اور غزل گو سمجھتے رہے۔

بآں رازے کہ گفتم پے نہ بردند زشاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند

وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرتے ہیں، آپ کا حکم اور فرمان تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو زندگی اور بقا و دوام کا پیغام پہونچاؤں، لیکن یہ ناحق شناس مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ عام اور پیشہ ور شعرا کی طرح میں لوگوں کی تاریخ وفات نکالتا اور قطعۂ تاریخ کہتا رہوں۔

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئے بگوشِ مردۂ پیغامِ جاں گوئے
ولے گویند ایں ناحق شناساں کہ تاریخِ وفات ایں واں گوئے

وہ بڑے درد و سوز اور بڑی حسرت اور تلخی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ علم اور وہ پیغام جو ان کے اشعار کی روح اور اصل قیمت ہے، اس سے لوگوں کو سب سے کم دلچسپی ہے، اور اس میں انھوں نے بڑی قناعت اور زہد کا ثبوت دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اپنی ساری متاع کھول کر میں نے بازار میں رکھ دی لیکن کوئی اس جنس نایاب کا خریدار نہ ملا، میں نے ارمغانِ دل پیش کرنا چاہا لیکن اس کا بھی کوئی قدرداں نظر نہ آیا، مجھ سے زیادہ غریب الوطن، بیگانہ اور تنہا اس دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔

ولے برکف نہادم دلبرے نیست متاعے داشتم غارت گرے نیست
درونِ سینۂ من منزلے گیر مسلمانے ز من تنہا ترے نیست

آخر میں وہ سلطان ابن سعود کو خطاب کرتے ہیں لیکن ان کا روئے سخن دراصل تمام عرب بادشاہوں اور عالم اسلام کے سربراہوں کی طرف ہے، اس میں انھوں نے غیر ملکیوں پر اعتماد کے نتائج سے آگاہ کیا ہے، اور ان کے بجائے خدا پر اور اس کے بعد خود پر بھروسہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر طناب تمہاری ہے تو جہاں چاہو اور جس وقت چاہو اپنا خیمہ گاڑ سکتے ہو اور ہر جگہ منزل بنا سکتے ہو اور اگر وہ نہیں تو پھر مستعار لے کر تم آزادی کے ساتھ کوئی قدم نہیں بڑھا سکتے۔

وہ کہتے ہیں کہ ذرا اپنے کو پہچاننے کی کوشش کرو، اس روئے زمین میں

تم کو وہ مقام حاصل ہے جس کی شام دوسروں کی سحر سے زیادہ آئینہ فام ہے۔

ترا اندر بیابانے مقام است
کہ شامش چوں سحر آئینہ فام است
بہر جائے کہ خواہی خیمہ گستر
طناب از دیگراں جستن حرام است



شکوہ اور مناجات

اقبال مردِ مومن تھے، ایمان و یقین پر انھیں پورا بھروسہ تھا، وہ اسے اپنی قوت کا راز اور سرمایۂ اعزاز سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ علوم و معلومات کا دفترِ بے پایاں سیدھے سادے ایمان کے سامنے بھی ہیچ ہے، وہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ مردِ فقیر تو لا الٰہ الا اللہ پر پختہ یقین اور اس کے کھلے ہوئے معنوں کی تصدیق کے سوا کچھ نہیں رکھتا، لیکن فقیہ و خطیب اس کی تعبیروں کا ایک انبار لگائے بیٹھے ہیں، لیکن معنی اور اس کے عملی تقاضے تک ان کی رسائی نہیں، گویا ان قارونوں کو اپنے خزانے سے مستفید ہونے کا حوصلہ نہیں ؎

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!

اسی طرح پیغامِ محمدی اور شخصیتِ نبیؐ سے انتساب انھیں ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھا، وہ ان کے سوا کسی اور مکتبِ فکر سے استفادہ اور کسی اور سرچشمہ سے سیرابی

غیرت و محبت کے خلاف سمجھتے تھے، وہ اپنے ایک شعر میں بڑے پرتاثیر لہجے میں عرض رسا ہیں:۔

خواجۂ ما نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پر نکند پیالہ را

آخر عمر میں ان کی بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا اور وہ بھوپال میں مقیم تھے کہ ۱۳ راپریل ۱۹۳۶ء کو عالم اسلام کے افسوسناک حالات، اس کی روحانی و فکری پسماندگی، اسلامی شخصیات کے فقدان، نئی نسل کے مغربیت کی طرف رجحان اور اپنے پیغام سے غفلت کے احساسات نے انھیں بیقرار کردیا اور اس موقع پر جذبات کی شدت نے ان سے بہت سے مؤثر شعر کہلوائے، ان میں انھوں نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض و معروض کی اور عالم اسلام کی ذہنی اور عملی پسماندگی عروج کے بعد زوال، اور نشاط کے بعد اضمحلال کی شکایت کی اور کہا کہ حضور! میں اس امت کی شکایت کرنا چاہتا ہوں جس پر آج موت کا خوف طاری ہے، آپ نے لات ومنات کے بت توڑ دئیے اور دنیا کی از سر نو تعمیر کی اور اس کی بوڑھی ہڈیوں میں جوانی کا خون دوڑا دیا جس کے نتیجے میں آج دنیا میں ایمان ویقین، ذوق وشوق اور عبادت وتقویٰ کا دور دورہ ہے، اور آپ کے کلمہ سے وہ بیداری اور حضوری اور نور وسرور حاصل کر رہی ہے، ہم بھی ایک بت پرست ملک میں پیدا ہوئے، لیکن گائے بیل کی پوجا سے ہم بلند ہو گئے اور پروہتوں اور سنیاسیوں کے آگے ..... سر نہیں جھکایا اور نہ دیوی دیوتاؤں کو سجدے کئے اور نہ بادشاہوں اور وزیروں کے آستانے کی خاک بوسی کی، یہ سب آپ کے دین اور آپ کی محنت کا نتیجہ ہے

ہم نے بھی آپ کے اس "خوانِ یغما" سے زلہ ربائی کی ہے جس سے ایک عالم سیر ہو رہا ہے، آپ ہی کی ذات اور آپ کے ارشادات اس امت مرحومہ کا سرمایۂ ذوق اور مصدرِ شوق صدیوں سے بنے رہے ہیں، اور آپ کی تعلیمات ہی کے سبب یہ امت، فقیری میں خوددار، اور محتاجی میں بھی بے نیاز اور آبرودار رہی ہے، لیکن آج عالم اسلام نے اپنی قوت و قیمت کا بیشتر حصہ کھو دیا ہے۔

اے تو مابے چارگاں را ساز و برگ — وارہاں ایں قوم را از ترس مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را — تازہ کردی کائنات کہنہ را
در جہانِ ذکر و فکر و انس و جاں — تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگ اذاں
لذت سوز و سرور از لا الٰہ — در شب اندیشہ نور از لا الٰہ
نے خدا ہا ساختیم از گاو و خر — نے حضور کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیش معبودانِ پیر — نے طواف کوشک سلطان و میر
ایں ہمہ از لطف بے پایانِ تست — فکر ما پروردۂ احسان تست
ذکر تو سرمایۂ ذوق و سرور — قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
اے مقام و منزل ہر راہ رو — جذب تو اندر دل ہر راہ رو
ساز ما بے صوت گردید آنچناں — زخمہ بر رگہائے او آید گراں

اقبال خدمتِ رسالت مآب میں کہتے ہیں: میں عالم اسلام میں بہت پھرا اور عرب و عجم کو دیکھا لیکن آپ کے پیروؤں اور یاد کرنے والوں کو بہت کم، لیکن ابولہب کے نام لیواؤں کو ہر جگہ پایا اسلامی جوانوں کے دماغ روشن لیکن قلب و ضمیر تاریک ہو گئے ہیں، ان کی جوانی نرمی و نزاکت کا نمونہ ہے، رجائیت، اور بعد نظر سے

ان کا دامن خالی ہے، وہ غلامی کی افتاد پر پیدا ہو رہے ہیں، اور اسی طرح کی نسلیں یکے بعد دیگرے جنم لے رہی ہیں، وہ خوئے غلامی میں اتنے پختہ ہیں کہ آزادی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، تعلیم جدید نے ان سے دینی احساسات چھین کر انھیں بے حیثیت بنا دیا ہے، وہ مغرب کے پیچھے دیوانہ وار چلے جا رہے ہیں، لیکن انھیں اپنی قیمت کا پتہ نہیں، وہ مغرب سے بھیک مانگتے اور اس کے بدلے اپنی روح اور ضمیر کو بیچتے ہیں، اس طرح یہ شاہین زادے وہ ممولے بن گئے ہیں، جو فضا کی وسعتوں کی تاب ہی نہیں لا سکتا۔

نئی نسل کے معمار..... اور اساتذہ بھی چونکہ نکمے ہیں، اس لئے وہ بھی انھیں خودی کی تعلیم نہ دے سکے اور نہ انھیں ان کے منصب و مقام سے آگاہ کر سکے آتش فرنگ نے نئی نسل کو موم کی طرح پگھلا دیا اور اسے اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

مسلمان آج موت و شہادت کی لذت سے بے خبر ہو چکا ہے اور "لاغالب الا اللہ" کا یقین کھو چکا ہے، اب اسے حیات چند روزہ ہی کی فکر ہر دم لگی رہتی ہے، اور ایک روٹی کے لئے سو انسانوں کی خوشامد اس کا پیشہ بن گیا ہے، فرزند ابراہیمؑ آج بت شکنی کے بجائے بت تراشی کر رہا اور فرنگ سے نئے اصنام درآمد کر رہا ہے، یہ نسل نشاۃ ثانیہ کی محتاج ہے۔ آج اس سے پھر "قم باذن اللہ" کہنا ہوگا، ہمیں مغرب نے مسحور ہی نہیں کیا بلکہ بغیر لڑے اس نے ہمارا خاتمہ کر دیا، آپ کے اصحاب نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دئے تھے، آج پھر اس مردِ مومن کی ضرورت ہے جو ایمان و یقین سے تہذیب جدید کے سحر و افسون کا

طلسم توڑ دے۔

در عجم گردیدم و ہم در عرب — مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ — ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ!
در جوانی نرم و نازک چوں حریر — آرزو در سینۂ او زود میر
ایں غلام ابن غلام ابن غلام — حریت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود — از وجودش ایں قدر داند کہ بود
ایں ز خود بیگانہ ایں مست فرنگ — نان جو می خواہد از دست فرنگ
ناں خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک — داد مارا نالہائے سوزناک
دانہ چیں مانند مرغاں سراست — از فضائے نیلگوں ناآشناست
شیخ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقام او نداد او را خبر
آتش افرنگیاں بگداختش — یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش
مومن و از رمز مرگ آگاہ نیست — در دلش لاغالب الا اللہ نیست
ما ہمہ افسونیٔ تہذیب غرب — کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جام او شکست — وانمایک بندۂ اللہ مست
تا مسلماں باز بیند خویش را — از جہانے برگزیند خویش را

اقبال التجا کرتے ہیں "اے شہسوار گردوں رکاب! خدارا ذرا دیر کے لئے رکاب بوسی کا موقع دیجئے کہ اپنے احزان و آلام کا بیان کر سکوں حالانکہ میری زبان گنگ اور ناطقہ سر بگریباں ہے اور شوق و ادب میں کشمکش ہے، شوق کہتا ہے کہ دوست قریب ہے، تاب گویائی پیدا کر! اور ادب مانع ہوتا ہے کہ فضول گوئی

چھوڑ۔ لب بند کر اور آنکھیں کھول۔ لیکن توسنِ شوق ادب کے قابو سے نکلا جاتا ہے

شہسوارا! ایک نفس درکش عناں　　حرف من آساں نیاید بر زباں
آرزو آید کہ ناید تا بلب؟　　می نہ گردد شوق محکوم ادب
آں بگوید لب کشا اے دردمند　　ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند

حضور میں وہ صیدِ لاغر و زبوں ہوں جسے کسی صیاد نے نہیں پوچھا لیکن وہ آپ کی طرف بھاگ کر اور ایک امید لیکر آیا، میری آواز ہجوم آرزو سے دب گئی ہے اور دل کا شعلہ زبان تک نہیں آتا، میری آتش نفسی اب دل کی آگ سے خالی ہو رہی ہے، اور قرآن فجر کی لذت سے محروم ہوا جاتا ہوں، وہ نفس جس کی گنجائش سینہ میں نہ ہو وہ اس میں اسیر بن کر ہی رہ سکتا ہے، حالانکہ اس کے لئے تو اسے لامحدود فضاؤں کی حاجت اور بیکراں آسمانوں کی ضرورت ہے، میری جسمانی اور روحانی بیماریوں کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ آپ ایک نظر سے ہمیں نواز دیں، طبیبوں کے نسخے میری بیمار روح کے لئے سازگار نہیں، میری لطافت طبع کڑوی کسیلی دواؤں کی متحمل نہیں، میرے گریۂ پیہم پر رحم کیجئے اور کوئی داروئے خوشگوار تجویز کیجئے، میں بوصیری کی طرح عرض پرداز ہوا ہوں کہ میری نوائے رفتہ مجھے واپس ملے، گنہگار ہی آپکی شفقت کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں، اور شفیق مائیں اپنے کمزور اور بیمار بچوں ہی کو زیادہ چاہتی ہیں:—

گرد تو گردد حریم کائنات　　از تو خواہم یک نگاہِ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی　　کشتی و دریا و طوفانم توئی!
اے پناہ من حریم کوئے تو　　من بامیدے رمیدم سوئے تو

آہ ازاں دردے کہ درجان و تن است　　گوشۂ چشم تو دارو ئے من است
چوں بصیری از تو می خواہم کشود　　تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است　　در خطا بخشی چو مہر مادر است

اقبال اپنی عرض جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں میں پرستارانِ شب کے ساتھ ہمیشہ جنگ آزما رہا ہوں، میری قندیل کو اور فروزاں کر دیجئے آپ کا وجود دنیا کیلئے فصل بہار تھا، اور چمن انسانیت کیلئے موسم خوشگوار، کیوں نہ نسیم جانفزا کا ایک جھونکا میری طرف بھی آنکلے اور آفتاب عالمتاب کی ایک کرن ذرۂ حقیر کو چمکا دے جسم کی قیمت روح سے ہے، اور روح، محبوب کے دم سے ہے۔

میری روشنیٔ طبع نے فقہ و اسرارِ دین و شریعت تک پہنچا دیا لیکن میدانِ عمل میں میری ہمت جواب دے گئی، میری مہم فرہادِ خاراشکن سے بھی زیادہ مشکل اور روح فرسا ہے، مجھے اس سے زیادہ قوت و ہمت اور صلاحیت کی ضرورت ہے کہ میں عصر حاضر میں اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر سکوں۔ آپ میری شمشیر آبدار کی سان تیز کر دیں کہ یہ کند ہے، لیکن جوہر سے خالی نہیں۔

میں نے اگرچہ اپنی زندگی ضائع اور جوانی رائگاں کی ہے، لیکن ایک شئے لطیف جسے "دل" کہتے ہیں اسے میں نے محفوظ رکھا ہے، اس کے بارے میں ہمیشہ خود دار و غیرت مند رہا اس لئے کہ اس پر شروع ہی سے آپ کے سمند ناز کا نقش کفِ پا ثبت تھا ——— جو غلام دنیا سے کوئی مطلب نہیں رکھتا وہ اپنے مالک ہی کی رضا اور مہربانی کا جویا رہتا اور اس کے ہجر و فراق کو موت سمجھتا ہے۔

اے وہ برگزیدہ ہستی! جس نے ایک کرد[1] کو سوزِ عربی بخشا، ایک ہندوستانی کو بھی اجازت مرحمت فرما کہ وہ حاضری دے اور کچھ عرض کرے، وہ ایک دلِ خوں گشتہ اور ایک جگرِ تفتہ لے کر خدمت میں آیا ہے، اس کے جاننے والے دوست اور عزیز بھی یہ نہیں جانتے کہ اس کے غم والم کا کیا حال ہے؟ میں وہ بانسری ہوں جو اپنی اصل سے جدا ہے، لیکن عہد وصال کی یاد میں نغمہ ہائے فراق اس کے سینے میں گونج رہے ہیں اور غمِ جدائی کی شکایت سے اس کا دل لبریز ہے میں وہ چوب خشک صحرا ہوں جسے کارواں آگ لگا کر روانہ ہو گیا اور اسے پیچھے چھوڑ گیا لیکن وہ مسلسل جلتی رہی اور اس کا وجود شعلہ و شرار بنکر بکھرتا رہا لیکن اس کی نیم سوختگی کو کسی اور کارواں کی تلاش اور اب تک اس کا انتظار ہے کہ وہ اس کے وجود کو سراپا سوز بنا دے:۔

اے وجودِ تو جہاں را نوبہار ۔۔۔ پرتوِ خود را دریغ از من مدار
خود بدانی قدرِ تن از جاں بود ۔۔۔ قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود
تا ز غیر اللہ ندارم ہیچ امید ۔۔۔ یا مرا شمشیر گرداں یا کلید
فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چست ۔۔۔ تخمِ کردارے ز خاکِ من نرست
تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من ۔۔۔ محنتے دارم فزوں از کوہ کن
مومنم از خویشتن کافر نیم ۔۔۔ بر فسانم زن کہ بد گوہر نیم
گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است ۔۔۔ چیزکے دارم کہ نامِ او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں ۔۔۔ کز سمِ شبدیزِ تو دارد نشاں
بندۂ را کو نخواہد ساز و برگ ۔۔۔ زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ

---

[1] سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرف اشارہ ہے، جو نسلاً کرد تھے،

ایکہ دادی کرد را سوزِ عرب — بندۂ خود را حضورِ خود طلب
بندۂ چون لالہ داغے در جگر — دوستانش از غمِ او بے خبر
بندۂ اندر جہان نالان چو نے — تفتہ جان از نغمہ ہائے پے بپے
در بیابان مثلِ چوبِ نیم سوز — کاروان بگذشت و من سوزم ہنوز
اندرین دشت و درے پہناورے — بو کہ آید کاروانے دیگرے
جان ز مہجوری بنالد در بدن — نالۂ من وائے من اے وائے من[1]



[1] پس چہ باید کرد ۱۷-۶۴

اقبال اور قومیت و وطنیت[1]

اقبال وطن دوست ہیں، لیکن وطن پرست نہیں، اس لئے کہ اسلام نے حب وطن کو ایمان کا تقاضا سمجھتے ہوئے بھی اس کی پرستش، بے جا طرفداری اور اس کے لئے اندھی عصبیت سے روکا ہے ــــ اسلام نے وطنی عصبیت ہی نہیں بلکہ رنگ ونسل، زبان اور تہذیب کی عصبیت اور تعصب سے بھی منع کیا ہے، اور انسان کو اِن تمام چھوٹے چھوٹے گھروندوں اور تنگ وتاریک دائروں سے باہر نکال کر بین الاقوامی انسانی برادری کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے آجکل کی چلی ہوئی قومیت (NATIONALISM) اور وطنیت جس کا سرچشمہ یورپ کی سرزمین ہے اقبال کی نظر میں شرک اور بت پرستی سے کم نہیں، انھیں اسلام اور قوم پرستی میں کھلا تضاد نظر آتا ہے۔ اور وہ اسے غارتگر دین، اور اس کے پیرہن کو مذہب کا کفن بتاتے ہیں، اس معاملہ میں اقبال کا ذہن شروع ہی سے صاف تھا کہ اسلام،

---

[1] اضافہ بقلم مترجم

قومیت و وطنیت کا قائل نہیں، میں ان لوگوں سے متفق نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال پہلے وطنیت کی طرف آئے پھر ملت کی طرف، بلکہ صحیح یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک وطن دوست ہوتے ہوئے بھی ملت اور اسلام کی آفاقیت کے قائل رہے، ۱۹۰۵ء کے بعد کے کلام میں ان کے یہ شعر اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

بانگ درا میں اقبال نے اپنا نقطۂ نظر بالکل واضح کر دیا تھا کہ ملت اسلامیہ کی طاقت، کسی وطن سے نہیں، بلکہ توحید اور وحدتِ ملت سے ہے، ان کا خیال ہے کہ پوری کائنات، انسانی اولوالعزمیوں کی جولانگاہ ہے، اس لئے کسی مقام و سرزمین سے بندھ جانا تباہی اور آزادی کو کھو دینے کے مرادف اور اپنے پاؤں میں بیڑی ڈال لینے کے برابر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہجرت کا اصول انسان کو عالمی انسانیت اور عالمگیر انسانی برادری کا ایک عظیم سبق تھا، جسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے درس گاہِ نبوت سے دیا۔ ان کے عقیدہ میں اس قوم پرستی اور وطن کی بیجا طرفداری اور حق و ناحق پاسداری کے سبب قوموں میں رقابت پیدا ہوتی ہے، استحصال سر اٹھاتا ہے، سیاست میں بے ایمانی اور بے اصولی رونما ہوتی ہے اور جنگل کے قانون کو بڑھاوا ملتا ہے، اپنی نظم "وطنیت" میں انھوں نے صاف طور پر یہ خیالات پیش کئے ہیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال نے مسلمانوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے کہ ملت اسلامیہ کی اساس ایمان و عقیدہ اور رسالت محمدیؐ کی ابدیت و آفاقیت پر ہے اور ان کی قوت کا سرچشمہ ان کی مذہب کے ساتھ وابستگی اور ملی اتحاد و اعتماد ہے، ان کا مذہب ہر مقام اور ہر زمانہ کے لئے ہے۔ اسرار خودی میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ

ملت اسلامیہ اپنے ایمان وعقیدہ اور اپنے نظام حیات کی وجہ سے زمان و مکاں کے حدود و قیود سے بہت بلند ہے، انھوں نے اپنے بلیغ اور مؤثر فن کارانہ اور حکیمانہ انداز میں ملت کو اس کی خودی سے روشناس کرایا، اور اس کے پیام و مقام کی آفاقیت اور عالمگیری پر زور دیا ہے۔

انھوں نے اس نکتہ کی بھی وضاحت کی ہے کہ اسلام اور مسلمان کسی ملک و سرزمین پر انحصار نہیں کرتے اسی لئے ملکی حدود کی تبدیلی، یا سیاسی عروج وزوال اور فتح و شکست سے اس انداز میں متاثر نہیں ہوتے جس طرح ملک و نسب پر انحصار رکھنے والی قومیں ہوتی ہیں۔

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا — تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے — نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

"دنیائے اسلام" ان کی ایک مؤثر نظم ہے، اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ اہلِ مغرب کی کوشش رہی ہے کہ خود عالم اسلام کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے، اور اتحادِ ملت کو کبھی مضبوط نہ ہونے دیا جائے اس میں انھوں نے ملت کو ان چالوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہے۔

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — حق ترا چشمے عطا کردست غافل در نگر

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر
جو کریگا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگزر

نظم "طلوع اسلام" میں فرماتے ہیں ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

اپنے دوسرے مجموعۂ کلام میں فرماتے ہیں ؎

تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانہ میں کوئی حیدر کرار بھی ہے
نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

اقبال کی زندگی میں ترکوں کے مقابلہ میں انگریزوں نے جسطرح عربوں میں قومیت کی روح بیدار کی اس کے خطرناک نتائج پر اقبال نے ملت کو متنبہ کیا، اور عربوں کو بتایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن آپؐ کے بعد وہ ایک عالمی مذہب و تہذیب کا سرچشمہ بن گیا، اور دنیا کی قیادت و امامت اس کے ہاتھ میں آگئی ؎

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی!

اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان کے واہمہ نے ہر دور میں نئے نئے بُت بنائے ہیں، اسی طرح اس زمانہ کا بُت انسان نے قوم و وطن کی شکل میں تراشا ہے، کمزور اور چھوٹی قوموں کی قربانی کا طالب رہتا ہے، اس لئے انسان کو انسانیت کی بحالی اور عالمی اخوت کے لئے اس بت کو توڑ دینا چاہئے ؎

فکر انساں بُت پرستے بت گرے | ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آذری انداخت است | تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب | نام او رنگ ست وہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند | پیش پائے ایں بت ناارجمند
اے کہ خوردستی زمینائے خلیل | گرمیٔ خونت زصہبائے خلیل
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن | تیغ لاموجود الاھو بزن!

وہ اسلام کے بخشے ہوئے اس جہانی اندازِ نظر پر فخر یہ کہتے ہیں:۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی، | خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی | گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

پھر ملت مسلمہ کی زبان سے کہتے ہیں ؎

مسلمانیم و آزاد از مکانیم | بروں از حلقۂ نہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کز وے | بہائے ہر خداوندے بدانیم

اسلامیت کی صفات کے بارہ میں کہتے ہیں، وہ غمخواری و دلداری، اور فرد کے

ملت میں گم ہو جانے کا نام ہے ؎

مسلمانی غمِ دل در خریدن — چوں سیماب از تپِ یاران تپیدن
حضورِ ملت از خود در گذشتن — دگر بانگ انا الملت کشیدن

آج کل کی طرح پہلے بھی اقوام متحدہ (یونائیٹڈ نیشنز) جو پہلے (لیگ آف نیشنز) کہلاتی تھی، بڑی طاقتوں کے اشارہ پر کام کرتی تھی اور چھوٹے ملکوں کو اس کے ذریعہ انصاف مشکل سے مِل پاتا تھا اُس کی ناکامی کے نتائج، اقبال کے سامنے آچکے تھے، اس لئے وہ اس سے کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھے، بلکہ اسے کفن چوروں کی انجمن کہنے لگے تھے، جو انھوں نے تقسیم قبور کے لئے بنائی ہے۔

اقبال، کہتے ہیں کہ مغربی قومیں مشرق اور ایشیا کو عدل و مساوات کا حق دینا نہیں چاہتیں اور ہمیشہ انھیں کمزور دیکھنا چاہتی ہیں اسی لئے وہ جب مجبوراً دنیا کو متحد کرنے اٹھتی بھی ہیں تو وحدتِ انسانیت کے نام سے نہیں بلکہ وحدتِ اقوام کے نام پر۔

یہ طریقہ انھوں نے اس مقصد سے اپنایا ہے کہ قوموں کے اندر احساس قومیت بیدار رہے اور وہ باہمی رقابت و عداوت کا کھیل کھیلتی رہیں، اور اس طرح بڑی قوموں کو مداخلت اور ثالثی کا موقع ملتا رہے، "مکہ اور جنیوا" کے عنوان سے انھوں نے لکھا تھا ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

جاوید نامہ میں نظریۂ قومیت پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

لُردِ مغرب آں سراپا مکر و فن | اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکرِ مرکز و تو در نفاق | بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت | دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت
چیست دیں برخواستن از روئے خاک | تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک
گرچہ آدم بردمید از آب و گِل | رنگ و نم چوں گُل کشید از آب و گِل
حیف اگر در آب و گِل غلطد مدام | حیف اگر برتر نہ پرد زیں مقام
گفت تن در شو بخاکِ رہ گزر | گفت جاں پہنائے عالم را نگر
جاں نگنجد در جہات اے ہوشمند | مردِ حُر بیگانہ از ہر قید و بند

حُر ز خاکِ تیرہ آید در خروش
زانکہ از بازاں نیاید کارِ موش

انھوں نے آل انڈیا ریڈیو (لاہور) کی استدعا پر یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو سالِ نو کے موقع پر اپنے پیغام میں دنیا کو انسان دوستی کی طرف بلایا اور قومیت کی ہلاکت خیزیاں یاد دلائیں ۔

"آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں، اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے، لیکن اس تمام ترقی کے باوجود استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔

ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا ....

وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے، اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے، جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس ناپاک قوم پرستی، اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہونگے "

خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس منعقدۂ لاہور ۱۹۳۲ء میں فرمایا تھا۔

" میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم کا مخالف ہوں اس لئے کہ مجھے اس تحریک میں مادیت اور الحاد کے جراثیم نظر آرہے ہیں، اور یہ جراثیم میرے نزدیک دورِ حاضر کی انسانیت کے لئے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہیں۔

اگرچہ حب وطن ایک فطری امر ہے، اور اس لئے انسان کی اخلاقی زندگی کا ایک جز ہے، لیکن جو شے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب اس کا کلچر اور اس کی ملی روایات ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنکے لئے

انسانوں کو زندہ رہنا چاہیئے، اور جنکی خاطر انھیں اپنی جان قربان کرنی چاہیئے، وہ خطۂ زمین جس میں وہ رہتا ہے، اور جس کے ساتھ عارضی طور پر اس کی روح وابستہ ہوتی ہے، اس لائق نہیں کہ اسے خدا اور مذہب سے برتر قرار دیا جائے۔"

اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے مارچ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:۔

"قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں، ہم سب ہندی ہیں، اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں، جو ہند کے نام سے موسوم ہے، علیٰ ہذا القیاس، چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے، اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے، مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں ————

———— وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے، ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے، چونکہ اسلام بھی ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا قانون ہے۔ اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔"

عورت، اقبال کے کلام میں[1]

جدید اردو شاعری میں غالبًا حالی و اقبال ہی دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں غزلوں میں صنفی آلودگی، عریانیت، اور سطحیت نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف عورت کے مقام و احترام اور اس کی حیثیت عرفی کو بحال کرنے میں ان دونوں کا بڑا ہاتھ نظر آتا ہے۔

اقبال عورتوں کے لئے وہی طرز حیات پسند کرتے تھے جو صدر اسلام میں پایا جاتا تھا جس میں عورتیں مروجہ برقع کے نہ ہوتے ہوئے بھی شرم و حیا، اور احساس عفت و عصمت میں آج سے کہیں زیادہ آگے تھیں، اور شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔

۱۹۱۲ء میں طرابلس کی جنگ میں جب ان کو اس کا ایک نمونہ دیکھنے کو ملا یعنی ایک عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تو

---

[1] اضافہ از قلم مترجم

انھوں نے اس کا زوردار ماتم کیا:۔

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے　　ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی　　غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر　　ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی　　ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں　　بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے　　نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے　　ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں　　پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

انھیں ہنروران ہند اور ایسے تمام فن کاروں سے شکایت تھی، جو عورت کے نام کا غلط استعمال کرکے ادب کی پاکیزگی، بلندی اور مقصدیت کو صدمہ پہنچاتے ہیں، وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں ۔

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورتگر و افسانہ نویس　　آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

وہ "دخترانِ ملت" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان خاتون کے لئے دلبری اور بناؤ سنگار ایک معنی میں کفر ہے، بلکہ انھیں تو اپنی شخصیت، انقلابی فطرت اور پاکیزہ نگاہی سے باطل کی امیدوں پر پانی پھیر دینا چاہیے۔

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا　　مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمالِ غازہ پرور　　بیاموز از نگہ غارتگری ہا

وہ کہتے ہیں کہ مسلمان عورت کو پردہ کے اہتمام کیساتھ بھی معاشرہ اور زندگی میں اس طرح رہنا چاہیے کہ اس کے نیک اثرات معاشرہ پر مرتب ہوں اور اس کے پرتو سے حریم کائنات اس طرح روشن رہے، جس طرح ذات باری کی تجلی حجاب کے باوجود کائنات پر پڑ رہی ہے ؎

ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب ست　　کشادش در نمودِ رنگ و آب ست
جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز　　کہ او با صد تجلی در حجاب ست

وہ دنیا کی سرگرمیوں کی اصل ماؤں کی ذات کو قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کی ذات امینِ ممکنات ہے اور انقلاب انگیز مضمرات کی حامل اور جو قومیں ماؤں کی قدر نہیں کرتیں ان کا نظامِ زندگی سنبھل نہیں سکتا ؎

جہاں را محکمی از امہات ست　　نہادِ شاں امینِ ممکنات ست
اگر ایں نکتہ را قومے نداند　　نظامِ کاروبارش بے ثبات ست

وہ اپنی صلاحیتوں اور کارناموں کو اپنی والدہ محترمہ کا فیض نظر بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آداب و اخلاق تعلیم گاہوں سے نہیں ماؤں کی گود سے حاصل ہوتے ہیں ؎

مرا داد ایں خرد پرور جنونے　　نگاہِ مادرِ پاک اندرونے
ز مکتب چشم و دل نتواں گرفتن　　کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے

وہ قوموں کی تاریخ اور ان کے ماضی و حال کو ان کی ماؤں کا فیض قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ماؤں کی پیشانیوں پر جو لکھا ہوتا ہے وہی قوم کی تقدیر ہوتی ہے ؎

خنک آں ملتے کز وارداتش — قیامت ہا بہ بیند کائناتش
چہ پیش آید چہ پیش افتاد اورا — تواں دید از جبینِ امہاتش

وہ ملت کی خواتین کو دعوت دیتے ہیں کہ ملت کی تقدیر سازی کا کام کریں، اور ملت کی شام الم کو صبح بہار سے بدل دیں اور وہ اس طرح کہ گھروں میں قرآن کا فیض عام کریں جیسے حضرت عمرؓ کی ہمشیر نے اپنی قرآن خوانی سے ان کی تقدیر بدل دی اور اپنے لحن و لہجہ کے سوز و ساز سے ان کے دل کو گداز کر دیا تھا ۔

زشام ما بروں آور سحر را — بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرأت تو — دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

اقبال معاشرتی اور عائلی زندگی میں ماں کے مرکزی مقام کے قائل ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ خاندانی نظام میں جذبۂ امومت اصل کا حکم رکھتا ہے اور اسی کے فیض سے نسل انسانیت کا باغ لہلہاتا رہتا ہے، ان کا خیال ہے کہ جس طرح گھر سے باہر کی زندگی میں مردوں کو فوقیت حاصل ہے، اسی طرح گھر کے اندر کی سرگرمیوں میں عورت اور خصوصًا ماں کی اہمیت ہے، اس لئے کہ اس کے ذمہ نئی نسل کی داشت و پرداخت اور دیکھ بھال ہوتی ہے، انسان کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہوتی ہے، ماں جتنی مہذب، شائستہ اور بلند خیال ہو گی بچے پر بھی اتنے ہی یہ اثرات مرتب ہوں گے۔ اور ایک اچھی اور قابل فخر نسل تربیت پا سکے گی ۔

وہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی

اقبال کی نظر میں عورت کا شرف و امتیاز اس کے ماں ہونے کی وجہ سے ہے

.....جو قومیں امومت (حق مادری) کے آداب نہیں بجالاتیں تو ان کا نظام ناپائدار اور بے اساس ہوتا ہے، اور خاندانی امن وسکون درہم برہم ہو جاتا ہے، افراد خاندان کا باہمی اتحاد و اعتماد ختم ہو جاتا ہے، چھوٹے بڑے کی تمیز اٹھ جاتی ہے، اور بالآخر اقدار عالیہ اور اخلاقی خوبیاں دم توڑ دیتی ہیں، ان کے خیال میں مغرب کا اخلاقی بحران اسی لئے رونما ہوا ہے کہ وہاں ماں کا احترام اور صنفی پاکیزگی ختم ہو گئی ہے۔

وہ آزادئ نسواں کی تحریک کے.... اسی لئے حامی نہیں کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز میں عورتوں کی غلامی ہے، اس سے ان کی مشکلات آسان نہیں اور پیچیدہ ہو جائیں گی، اور انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جذبۂ امومت ختم ہو جائیگا ماں کی ممتا کی روایت کمزور پڑ جائے گی، اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ جس علم سے عورت اپنی خصوصیات کھو دیتی ہے، وہ علم نہیں، بلکہ موت ہے، اور فرنگی تہذیب قوموں کو اسی موت کی دعوت دے رہی ہے:۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرتِ انساں کیلئے اسکا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کیلئے علم و ہنر موت

علم اوبارِ امومت برنتافت — بر سرِ شاخش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ — داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

اقبال کے خیال میں آزادئ نسواں ہو یا آزادئ رجال یہ دونوں کوئی معنی نہیں رکھتے، بلکہ مرد وزن کا ربط باہمی، ایثار، اور تعاون ایک دوسرے کے لئے ضروری ہے۔ زندگی کا بوجھ ان دونوں کو مل کر اٹھانا اور زندگی کو آگے بڑھانا ہے،

ایک دوسرے سے عدم تعاون کے سبب زندگی کا کام ادھورا اور اسکی رونق پھیکی ہو جائے گی۔ اور بالآخر یہ نوع انسانی کا نقصان ہوگا۔

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند — کائنات شوق را صورت گراند

زن نگہ دارندۂ نارِ حیات — فطرت او لوحِ اسرارِ حیات

آتش ما را بجانِ خود زند — جوہر او خاک را آدم کند

در ضمیرش ممکناتِ زندگی — از تب و تابش ثباتِ زندگی

ارجِ ما از ارجمندی ہائے او — با ہمہ از نقشبندی ہائے او

اقبال فرماتے ہیں کہ عورت اگر علم و ادب کی کوئی بڑی خدمت انجام نہ دے سکے تب بھی صرف اس کی ماتا ہی قابل قدر ہے، جس کے طفیل مشاہیر عالم پروان چڑھتے ہیں، اور دنیا کا کوئی انسان نہیں، جو اس کا ممنون احسان نہیں ؎

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

آزادیٔ نسواں کی تحریک سے مرد و زن کا رشتہ جس طرح کٹا اور اس کے جو برے نتائج سامنے آئے اقبال کی نظر میں اس کی ذمہ دار مغربی تہذیب ہے۔ "مرد فرنگ" کے عنوان سے کہتے ہیں۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا — مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں — گواہ اسکی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ۔۔۔ ہند و یوناں ہیں جسکے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ۔۔۔ مرد بیکار و زن تہی آغوش

اقبال پردے کی حمایت میں کہتے ہیں کہ پردہ عورت کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، وہ پردے میں رہ کر تمام جائز سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی کر سکتی ہے، کیونکہ خالق کائنات پس پردہ ہی کارگاہِ عالم کو چلا رہا ہے اس کی ذات گو حجاب قدس میں ہے، لیکن اس کی صفات کی پرچھائیاں بحر و بر پہ پھیلی ہوئی ہیں، مولانا آسی نے خوب کہا ہے ؎

بے حجابی یہ کہ ہر شے سے ہے جلوہ آشکار
اس پر پردہ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

اقبال عورت کو خطاب کرتے ہیں کہ ؎

جہاں تابی ز نور حق بیاموز
کہ او با صد تجلّی در حجاب است

وہ پردہ کے مخالفوں کے جواب میں کہتے ہیں کہ پردہ جسم کا حجاب ہے لیکن اسے عورت کی بلند صفات اور پنہاں امکانات کے لئے رکاوٹ کیسے کہا جا سکتا ہے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ چہرے پر پردہ ہو یا نہ ہو، بلکہ یہ ہے کہ شخصیت اور حقیقت ذات پر پردے نہ پڑے ہوں، اور انسان کی خودی بیدار اور آشکار ہو چکی ہو ؎

بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے ۔۔۔ خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے ۔۔۔ وہ خلوت نشیں ہے یہ جلوت نشیں ہے

ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم   کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

پردے کی حمایت وتائید میں اقبال نے "خلوت" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پردہ کی وجہ سے عورت کو یکسو ہو کر اپنی صلاحیتوں کو نسلوں کی تربیت پر صرف کرنے اور اپنی ذات کے امکانات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اس کے ساتھ ہی اسے سماجی خرابیوں سے الگ رہ کر اپنے گھر اور خاندان کی تعمیر کا سامان میسر آتا ہے، گھر کے پرسکون ماحول کے اندر اسے زندگی کے مسائل اور معاشرتی موضوعات کو سوچنے سمجھنے کی آسانیاں ملتی ہیں، اور اس طرح وہ اپنے اور دوسروں کے لئے بہتر کارگزاری کرسکتی ہے ؎

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے   روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے   ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے   وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر و لیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

ایک بڑا معاشرتی سوال یہ رہا ہے کہ مرد و زن کے تعلق میں بالادستی (UPPER HAND) کسے حاصل ہو اس لئے کہ دنیا کا کوئی بھی تعلق ہو اس میں کوئی ایک فریق شریک غالب کی حیثیت ضرور رکھتا ہے، اور یہ اس کائناتی حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر شے اور ہر انسان ایک دوسرے کا محتاج ہے، اور ہر ایک، ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے خصوصاً مرد و زن کے تعلقات میں چند چیزوں میں مرد کو عورت پر فضیلت اور اولیت حاصل ہے، اور یہ بھی کسی نسلی اور صنفی تفریق کی بنا پر نہیں بلکہ خود عورت کے

حیاتیاتی، عضویاتی فرق اور فطرت کے لحاظ کے ساتھ اس کے حقوق و مصالح کی رعایت کے پیش نظر ہے ـــــــ نگرانی اور "قوامیت" ایسی چیز نہیں جو مرد اور عورت دونوں کے سپرد کردی جاتی یا عورت کو دیدی جاتی، اقبال نے مغرب کے نام نہاد "آزادیٔ نسواں" کی پرواکئے بغیر عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی پرزور وکالت کی اور عورت کی حفاظت کے عنوان سے کہا ؎

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور — کیا سمجھے گا وہ جسکی رگوں میں ہے لہو سرد!
نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی — نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا — اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

یہ نظم درحقیقت حدیث شریف "لن یفلح قوم ولوا علیھم امرأۃ" کی ترجمانی ہے، انھوں نے اپنی دوسری نظم میں فرمایا ؎

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود
راز ہے اسکے تب غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرار حیات — گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اقبال اپنے کلام میں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ بلند ارشادات بھی لائے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ "حبب الی من دنیاکم الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" (مجھے دنیا کی چیزوں میں خوشبو اور عورتیں پسند کرائی گئی ہیں، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اقبال نے اس حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے کہ "جنت" ماؤں کے قدموں تلے ہے، انھوں نے امومت کو رحمت

کہا ہے، اور اسے نبوت سے تشبیہ دی ہے، ماں کی شفقت کو وہ پیغمبر کی شفقت کے قریب کہتے ہیں اس لئے کہ اس سے بھی اقوام کی سیرت سازی ہوتی ہے، اور ایک ملت وجود میں آتی ہے۔

آں یکے شمع شبستانِ حرم　　حافظ جمعیتِ خیر الامم
سیرتِ فرزند ہا از امہات　　جوہر صدق و صفا از امہات
آنکہ ناز د بر وجودش کائنات　　ذکر او فرمود با طیب و صلوٰة
گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں　　زیر پائے امہات آمد جناں
نیک اگر بینی امومت رحمت است　　زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است　　سیرتِ اقوام را صورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیر ما　　در خطِ سیمائے او تقدیر ما
آب بندِ نخلِ جمعیت توئی　　حافظِ سرمایۂ ملت توئی
ہوشیار از دست بردِ روزگار　　گیر فرزندانِ خود را در کنار

آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اقبال حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ملت اسلامیہ کی ماؤں کے لئے مثالی خاتون سمجھتے ہیں، اور جگہ جگہ ان کی اتباع کی تاکید کرتے ہیں، کہ وہ کس طرح چکی پیستے ہوئے بھی قرآن پڑھتی رہتی تھیں اور گھریلو کاموں میں مشکیزہ تک اٹھانے پر صبر فرماتی تھیں، اقبال کے خیال میں سیرت کی اسی پختگی سے حضرات حسنین رضؓ ان کی آغوش سے نکلے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ　　مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
آں ادب پروردۂ صبر و رضا　　آسیا گرداں و لب قرآں سرا

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند — چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند
تا حسینے شاخِ تو بار آورد — موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد!

وہ مسلمان خاتون کو وصیت کرتے ہیں کہ۔

اگر پندے ز درویشے پذیری — ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر — کہ در آغوش شبیرے بگیری!



اقبالؔ کے کلام میں تاریخی حقائق واشارات[1]

اقبالؔ تاریخ کے خصوصی طالب علم کبھی نہیں رہے، انھوں نے اس میں خصوصی بصیرت و مہارت کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، بلکہ بعض اوقات جب ان سے کسی ایسی کتاب پر جو کسی تاریخی موضوع پر لکھی گئی تھی، رائے دینے، اور تبصرہ کرنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے معذرت کر دی، اور کہہ دیا کہ تاریخ میرا خصوصی موضوع نہیں ہے، وہ اصلاً فلسفہ اور اس کے بعد کتاب الٰہی قرآن کے طالب علم تھے، لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں، ان کا مطالعہ نہایت وسیع، متنوع اور

---

[1] یہ مقالہ اردو میں اصلاً شکاگو، امریکہ کی ایک علمی مجلس میں پڑھنے کے لئے لکھا گیا تھا، اور اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی نے تیار کیا تھا، لیکن یہ سفر جو M. S. A (یونائیٹڈ اسٹیٹس اینڈ کناڈا) کی دعوت اور محب محترم عرفان احمد صاحب کی تحریک و کوشش پر ۱۱ر جولائی ۱۹۷۵ء کو ہونے والا تھا، بعض مجبوریوں کی بنا پر نہیں ہو سکا، اب یہ مقالہ جو اس ملتوی شدہ سفر کی یادگار ہے، "نقوش اقبال" کے تیسرے ایڈیشن میں شامل کیا جاتا ہے۔ جس کی صحیح جگہ یہی ہے۔ (مصنف)

عمیق تھا، انہوں نے اپنے اس وسیع و طویل مطالعہ کے دوران اقوام و ملل، سلطنتوں اور ملکوں نیز مذاہب و اخلاق اور مختلف انسانی تہذیبوں اور معاشروں کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا، اس طرح تاریخ اگرچہ ان کے مطالعہ کا مرکزی اور بنیادی موضوع نہیں تھا، لیکن انسانی تقدیر، انسانیت کے عروج و زوال اور انسانی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے ہر انسان کی طرح ان کو تاریخ سے دلچسپی تھی، پھر فلسفہ انسان کے اندر، حقیقت کی جستجو، منتشر اکائیوں اور غیر مربوط اجزاء میں وحدت و ربط، پیدا کرنے کی جو خواہش و صلاحیت پیدا کر دیتا ہے، اسباب و مقدمات سے نتائج، اور جزئیات سے کلیات تک پہنچنے کی جو عادت ڈال دیتا ہے، اور جس طرح فلسفی کی نظر، تغیرات و واقعات اور حوادث کی سطح پر نہیں ٹھہرتی، بلکہ اس سے گزر کر ان کی تہ تک پہنچتی ہے، اس سب کی بناء پر اور اس کی بدولت، وہ تاریخ کے تھوڑے مطالعہ سے بھی ان نتائج و حقائق تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں تاریخ کے وہ صدہا طالب علم اور عالم و مصنف نہیں پہنچتے جو فلسفیانہ عقل و نگاہ سے محروم اور تاریخ کے مکتب و مدرسہ کے روایتی طالب علم اور استاذ ہیں۔

ان صحیح اور عمیق حقائق و نتائج تک پہنچنے میں، ان کی قرآن مجید کے عمیق، مخلصانہ اور مسلسل مطالعہ نے بھی خاص رہنمائی کی جو نسل آدم اور انسانی جماعتوں اور گروہوں کی سعادت و شقاوت اور عروج و زوال کے ایسے ابدی اصولوں پر مشتمل ہے، اور دنیا میں پیش آنے والے حوادث اور اقوام و ملل کی ہلاکت و بربادی اور عروج و ترقی کے حقیقی اسباب کی اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے کہ عقل انسانی محو حیرت رہ جاتی ہے، اور اس کتاب کی جو دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے اقبال ہی کے الفاظ میں ایک

صحرانشیں امی پر نازل ہوئی تھی، اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کرپاتی کہ وہ ایک علیم وخبیر ذات اور خالق ارض وسماوات کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، انہوں نے جب سلطان شہید نادر خاں کو اپنی ملاقات کے موقع پر قرآن مجید کا ایک نسخہ پیش کیا تو انہیں ان الفاظ میں اس کا تعارف کرایا، وہ کہتے ہیں ؎

گفتم ایں سرمایۂ اہل حق است　　در ضمیر او حیات مطلق است
اندر او ہر ابتدا را انتہا است　　حیدر از نیروِ او خیبر کشا است

اسی طرح اسرار خودی میں فرماتے ہیں ؎

آں کتاب زندہ قرآن حکیم　　حکمت او لایزال ست وقدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

کلام اقبال کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہایت مفید، معلومات افزا اور بصیرت افروز ثابت ہوگا کہ اس میں ان کے مطالعۂ تاریخ کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں، اور اس سے تاریخ کے ایک سچے طالب علم اور انسانی تمدن ومعاشرہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والے انسان کو کیا رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اس نقطۂ نظر سے کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ بات ایک قیمتی انکشاف سے کم نہیں ہوگی کہ اقبال کے کلام میں بعض ایسے دقیق اور لطیف تاریخی اشارے آگئے ہیں، جن کی شرح میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے جاسکتے ہیں، انہوں نے اپنے بعض قطعوں اور مختصر نظموں اور بعض اوقات ایک شعر میں تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے، اور ان کی ایجاز کی سرحدیں شاعرانہ اعجاز سے مل گئی ہیں، جو اہم حقائق ان چند شعروں میں آگئے ہیں، ان کو اگر شرح وبسط کے ساتھ نثر کے صدہا صفحات میں،

تاریخی دلائل وشواہد کی تائید، اور کتابوں کے حوالوں کی مدد سے پیش کی جائے تو وہ اس قدر مؤثر اور دل نشیں نہیں ہو سکتے، جتنے ان کے شیریں اور دل آویز بیان اور جچے تلے لفظوں میں نظر آتے ہیں، ان کی علمی و تاریخی قدر وقیمت اور ان نتائج کی صداقت کا (جو ان اشعار میں پیش کئے گئے ہیں) اندازہ صحیح طور پر وہی کر سکتا ہے، جس کی عام انسانی تاریخ اور پھر اسلامی تاریخ اور قرآن مجید کے علوم و معارف پر وسیع اور گہری نظر ہو، نیز جس کی یہودیت اور عیسائیت، قدیم ہندوستانی مذاہب، فلسفہ، وادبیات عجم اور قرون وسطیٰ کی تاریخ پر بھی (جس کو مغربی دانشور اور مورخ بجا طور پر قرون مظلمہ DARK AGES) کے نام سے یاد کرتے ہیں، وسیع اور گہری نظر ہو، ہم یہاں پر ان کی اس تاریخی بصیرت اور قرآنی حکمت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں، جن کے انتخاب میں کلام اقبال کے دریا کو کھنگالنے اور ان کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، ان کے انتخاب میں زیادہ تر حافظہ پر، اور ان کی تشریح و توثیق میں قارئین کی عام معلومات اور ان کے اس تاریخی مطالعہ پر جو ایک اوسط درجہ کے پڑھے لکھے انسان کا ہوتا ہے، اعتماد کیا گیا ہے، ان حقائق کی عظمت کا صحیح ادراک کرنے، اور اقبال نے اپنے جن خیالات اور نتائج فکر کا اعلان کیا ہے، ان کی صحت و واقعیت تسلیم کرنے کے لئے پہلے ان کے تاریخی پس منظر اور ماحول کو سمجھنے کی ضرورت ہوگی، جن سے ان تاریخی اشارات کا تعلق ہے، اس لئے ہم ان اشعار کو نقل کرنے سے پہلے جس سیاق وسباق میں وہ کہے گئے ہیں، اس کو بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

قدیم مذاہب بالخصوص یورپ کی مسیحیت نے انسانی زندگی کو دو خانوں میں "دین" و "دنیا" میں تقسیم اور دنیا کو دو کیمپوں، "اہل دین" اور "اہل دنیا" میں

بانٹ دیا تھا، جو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جدا تھے، اور ان کے درمیان ایک موٹی سرحدی لکیر اور وسیع خلیج حائل تھی، بلکہ یہ دونوں خانے ایک دوسرے سے متصادم اور یہ دونوں کیمپ باہم متحارب تھے، ان کے نزدیک دین و دنیا میں شدید رقابت تھی، جس کو ان میں سے کسی ایک سے رسم و راہ پیدا کرنی ہو، اس کو دوسرے سے کلی طور پر قطع تعلق اور اعلانِ جنگ کرنا ضروری تھا، کوئی انسان ایک وقت میں (ان کے بقول) دو کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتا تھا، معاشی جد و جہد، غفلت اور خدا فراموشی کے بغیر، حکومت و سلطنت دینی و اخلاقی تعلیمات کو نظر انداز کئے اور خوف خدا سے بے نیاز ہوئے بغیر، اور دین دار بننا، تارک الدنیا ہوئے بغیر متصور ہی نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ انسان عام طور پر سہولت پسند واقع ہوا ہے، دین کا ایسا تصوّر جس میں دنیا کے کسی جائز تمتع، ترقی اور سربلندی اور طاقت و حکومت کے حصول کی گنجائش نہ ہو، انسانوں کی اکثریت کے لئے قابل قبول اور قابل برداشت نہیں ہے، یہ اس کی فطرت کے خلاف ایک جنگ اور اس کی فطری خواہشات کو کچلنے کی سعی لاحاصل کے مرادف ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے متمدن، ذہین، صاحب صلاحیت اور عملی انسانوں کی بڑی تعداد نے، اپنے لئے دین کے بجائے دنیا کا انتخاب کیا، اور اس نے اس پر اپنے کو (ایک ناگزیر حقیقت اور ضرورت کی بنا پر) مطمئن اور راضی بھی کر لیا، وہ ہر قسم کی دینی ترقی سے مایوس ہو کر دنیا کے حصول اور اس کی ترقی میں ہمہ تن مشغول ہو گئی، دین و دنیا کے اس تضاد کو ایک بدیہی اور مسلّم حقیقت سمجھ کر انسانوں کے مختلف طبقوں، اور انسانی اداروں نے عام طور پر مذہب کو خیرباد کہا، سیاست و ریاست نے مذہب کے نمائندہ کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اور اپنے کو اس کی ہر پابندی

سے آزاد کرلیا، اس کا نتیجہ ظاہر تھا، حکومتیں "پیل بے زنجیر" اور معاشرہ "شتر بے مہار" ہوکر رہ گیا، دین و دنیا کی اس دوئی، اور اہل دین اور اہل دنیا کی اس رقابت نے نہ صرف یہ کہ مذہب و اخلاق کے اثر کو محدود و کمزور اور انسانی زندگی، اور انسانی معاشرہ کو اس کی آسمانی برکت و رحمت سے محروم کر دیا، بلکہ الحاد و لادینیت کا دروازہ چوپٹ کھول دیا، جس کا سب سے پہلے یورپ شکار ہوا، پھر دنیا کی دوسری قومیں، جو یورپ کے فکری، علمی، یا سیاسی اقتدار کے زیر اثر آئیں، اس سے کم و بیش متاثر ہوئیں، قرون وسطیٰ[1] میں مسیحی رہبانیت کے پرجوش داعیوں، اور غالی مبلغوں نے جن کے نزدیک انسانیت سے بڑھ کر روحانی ترقی میں کوئی چیز سد راہ نہ تھی، اور جنہوں نے فطرت دشمنی، مردم بیزاری، اور جسمانی تعذیب پر کمر باندھ رکھی تھی، اس آگ پر تیل کا کام کیا[1]، اور مذہب کو ایسی مہیب اور وحشیانہ شکل میں پیش کیا، جس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مذہب و اخلاق کا زوال اور نفس پرستی (اپنے وسیع معنی میں) کا عروج اپنے آخری نقطہ پر پہنچ گیا، اور دنیا نہ صرف یہ کہ ان دو انتہائی سروں کے درمیان جھولا جھولنے لگی، بلکہ وہ مذہب کے بے وزن اور بے اثر ہو جانے کی وجہ سے لادینیت اور اخلاقی انتشار کی عمیق خندق میں جا گری[2]۔

بعثت محمدیؐ کا عظیم، ناقابل فراموش احسان اور گراں قدر تحفہ یہ انقلاب انگیز اعلان ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا اصل انحصار

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ" جلد دوم۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈریپر کی کتاب "مذہب و سائنس" یا مصنف کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ۲۵۲ تا ۲۵۹

انسان کی ذہنی کیفیت، عمل کے محرکات، اوراس کے مقصد پر ہے، جس کو اسلام کی دینی شریعت کی زبان میں "نیت" کے ایک مفرد وسادہ، لیکن نہایت عمیق ووسیع لفظ میں ادا کیا گیا ہے[۱]۔ اس کے نزدیک نہ کوئی چیز مستقل دنیا ہے، نہ کوئی چیز مستقل دین، اس کے نزدیک خدا کی رضا کی طلب، اخلاص اوراس کے حکم کی تعمیل کے جذبہ وارادہ کے ساتھ بڑے سے بڑا دنیاوی عمل، یہاں تک کہ حکومت، جنگ، دنیاوی نعمتوں سے تمتع، نفس کے تقاضوں کی تکمیل، حصول معاش کی جدوجہد، جائز تفریح طبع کا سامان، ازدواجی وعائلی زندگی، سب تقرب الی اللہ کا ذریعہ، اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب ولایت تک پہنچنے کا وسیلہ، اورخالص "دین" بن جاتی ہے، اس کے برخلاف وہ بڑی سے بڑی عبادت اور دینی کام، جو رضائے الٰہی کے مقصد اوراطاعت کے جذبہ سے خالی ہو، اور خدا فراموشی اورغفلت کے ساتھ ہو، (حتیٰ کہ فرض عبادتیں، ارکانِ اسلام، ہجرت وجہاد، قربانی اورسرفروشی اورذکر وتسبیح) خالص دنیا، اورایسا عمل شمار ہوگا، جس پر کوئی ثواب اوراجر نہیں ہے، بلکہ وہ بعض اوقات وبال کا موجب اور خدا سے دوری کا سبب ہو جائے گا[۲]۔

---

[۱] مشہور وصحیح حدیث جو شہرت واستفاضہ کے درجہ کو پہنچ چکی ہے، اورجس سے حدیث کے جلیل القدر امام، امام بخاری نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح" کا آغاز کیا ہے، اس کے ابتدائی الفاظ ہی یہ ہیں "إنما الاعمال بالنیات وإنما لامرء ما نوی" (تمام انسانی اعمال کا اعتبار، اوران کا دارومدار نیتوں ہی پر ہے، اورآدمی کو اس کی نیتوں ہی کے مطابق پھل ملتا ہے) بعض ائمۂ اسلام کا قول ہے کہ اسلام کا ایک تہائی حصہ اس حدیث میں آگیا ہے۔

[۲] اس کی تائید میں صریح احادیث سے کتب حدیث کے دفتر بھرے ہوئے ہیں، ملاحظہ ہو ابواب اخلاص ونیت اورایمان واحتساب۔

(باقی صفحہ ۳۰۰ پر)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عظیم ترین معجزہ اور انقلاب انگیز اور عہد آفریں کارنامہ ہے کہ آپؐ نے دین و دنیا کی اس دوئی کو دور کیا، اور ان دونوں بچھڑوں کو جو سیکڑوں برس سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے، اور بارہا خون آشام جنگیں لڑ چکے تھے، گلے ملایا، یہ آپؐ کی خصوصیت ہے کہ آپؐ کامل طور پر "رسول وحدت" اور بیک وقت "بشیر" و "نذیر" ہیں، آپؐ نے دنیا کے انسانوں کو متحارب کیمپوں سے نکال کر حسنِ عمل، خدمتِ خلق، اور حصول رضائے الٰہی کے ایک ہی محاذ پر کھڑا کر دیا، اور سب کو اس جامع اور انقلاب انگیز دعا کی تلقین کی کہ "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ" اور "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ مومن کی زندگی متفرق و متضاد وحدتوں کا مجموعہ نہیں، بندگی و عبودیت کی ایک ہی اکائی اور وحدت ہے، یہاں لباس دنیا میں درویش، قبائے شاہی میں فقیر و زاہد، سیف و تسبیح کے جامع، رات کے عبادت گزار، اور دن کے شہسوار نظر آئیں گے، اور ان کو اس میں کسی قسم کا تضاد بلکہ دشواری بھی محسوس نہیں ہوگی۔

اس تمہید کے بعد آپ اقبال کی یہ نظم پڑھیئے، جو انہوں نے دین و سیاست کے عنوان پر لکھی ہے، کس طرح انہوں نے عیسائیت اور اسلام، قرونِ وسطیٰ، عصر حاضر اور مسیحی و اسلامی تعلیمات کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، جو اپنی پوری علمی سنجیدگی اور وقار

(باقی ص ۲۹۹ کا) اقبال کے معنوی استاد و مرشدِ روشن ضمیر، اور اسلام کے ایک عارف و شارح مولانا جلال الدین رومیؒ نے اس مضمون کو اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

چیست دنیا؟ از خدا غافل شدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

جلال کے ساتھ، اپنی شیرینی و دلآویزی کی بدولت ایک کوزۂ نبات معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربہ زیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا — بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری[1]

طویل انسانی تاریخ کی جو بزم سے زیادہ رزم کے افسانوں پر مشتمل ہے، اور جس کے بڑے حصے کو خوں ریز اور خون آشام جنگوں اور افراد و جماعتوں کی طالع آزمائیوں، اور مہم جوئیوں کی تفصیلات نے گھیر رکھا ہے، شہادت ہے کہ کسی فرد یا جماعت میں قوت و اقتدار کے مرکوز ہوجانے نے بنی نوع انسان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا، اور تاریخ کو اتنا زیروزبر نہیں کیا، جتنا نشۂ قوت اور احساس برتری نے کیا، جس وقت کسی فرد یا جماعت پر یہ احساس مستولی ہوجاتا ہے کہ اب اس سے زیادہ طاقت ور کوئی نہیں، وہ ایک سیلِ رواں ہے، جس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا، وہ خدا کی تقدیر ہے، جس کو کوئی بدل نہیں سکتا، ساری دنیا اور ہمسایہ قومیں اس کے رحم و کرم پر ہیں، اصل حقیقت اور اصل قانون طاقت ہے، انسانیت، عدل و انصاف، اخلاق و ضمیر، خوب و ناخوب، مناسب و

[1] بال جبریل

نامناسب، سب بے معنی الفاظ اور کمزوروں اور بے دست وپا قوموں اور افراد کی غلامانہ وشکست خوردہ منطق ہے، جب جنگل کے قانون (MIGHT IS RIGHT) طاقت ہی اصل دلیل اور حق وباطل کا معیار ہے، فلسفہ کی مکمل طور پر فرمانروائی ہوتی ہے، خوف خدا، انسانیت کا احترام، شرم ولحاظ، بزدلی اور کمزوری کی علامت سمجھی جانے لگتی ہیں، وسائل مقاصد بن جاتے ہیں، اور مقاصد غیر محدود شکل اختیار کرلیتے ہیں، توپھر نشۂ قوت میں سرشار فرد یا جماعت ایک ایسی اندھی تخریبی طاقت اور کوہ آتش فشاں کا ایک ایسا آتشیں سیلاب لاوہ بن جاتا ہے، جس کے سامنے نہ سلطنتیں ٹھہرتی ہیں، نہ تہذیبیں، نہ اخلاقی تعلیمات، نہ پیشوایان مذہب کی مساعی جمیلہ کے نتائج، اور ان کے قائم کئے ہوئے وہ ادارے جو صدیوں سے انسانیت کے حق میں فیض رساں و رچشمۂ رحمت تھے، یہ آتشیں سیلاب سیکڑوں ہزاروں برس کی تعمیری کوششوں، علم وادب کے اندوختوں، بلکہ آئندہ کئی صدیوں تک کے لئے تعمیر انسانیت کی توقعات اور امیدوں پہ پانی پھیر دیتا ہے، بستیوں کی بستیاں اور شہر کے شہر بے چراغ ہوجاتے ہیں، آباد اور پررونق بستیوں پہ ہل چل جاتے ہیں، آبادیاں خرابات میں، شہر قبرستانوں میں، عبادت گاہیں میخانوں اور قمارخانوں میں، علم ودانش کے مرکز تفریح گاہوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں، معاشرہ اس طرح زیروزبر ہوجاتا ہے کہ ہر بلند پست اور ہر معزز ذلیل ہوکر رہ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے اپنے معجزانہ انداز میں چند لفظوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے اس نے ملکۂ سبا کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو اپنی لافانی کتاب میں ذکر کرکے ایک طرح سے ان پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا　　بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو

وَجَعَلُوْا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃً وَّکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ۔ (النمل ۳۴)

اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور اسی طرح یہ بھی کریں گے۔

اسی نشۂ قوت اور حد سے بڑھے ہوئے احساس برتری کی دنیا کی وہ گذشتہ قومیں شکار ہوئیں، جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے، اور جنہوں نے صرف تخریبی اور مفسدانہ کردار ادا کیا، اور ایک مست و مجنوں ہاتھی کی طرح انہوں نے اپنے ہم جنس انسانوں اور ہمسایہ قوموں کو سبزہ کی طرح روند ڈالا، انہیں میں سے ایک قوم عاد تھی، جس کی قرآن مجید نے اسی بیماری کی نشاندہی کی ہے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَکْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۝ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً ؕ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَھُمْ ھُوَ اَشَدُّ مِنْھُمْ قُوَّۃً ؕ وَکَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ۝ (فصّلت ۱۵)

جو عاد تھے ناحق ملک میں غرور کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم سے بڑھ کر قوت میں کون ہے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا جس نے ان کو پیدا کیا، وہ ان سے قوت میں بہت بڑھ کر ہے، اور وہ ہماری آیتوں سے انکار کرتے تھے۔

اس خدا فراموشی، خودمستی و خود پرستی کا نتیجہ، طاقت کے اس آزادانہ استعمال کی شکل میں ہوا، جو تمام حدود و قیود سے آزاد، نتائج و عواقب سے بے نیاز اور جرم و سزائے جرم کے باہمی تناسب سے بے فکر تھی، خدا کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے جو اس سرکش قوم عاد میں مبعوث ہوئے تھے، ان کی انہیں بیماریوں کی نشاندہی کی۔

اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ۝ (الشعراء ۱۲۸ — ۱۳۰)

بھلا تم جو ہر اونچی جگہ پر نشان تعمیر کرتے ہو، اور محل بناتے ہو، شاید تم ہمیشہ رہو گے، اور جب تم (کسی کو) پکڑتے ہو تو ظالمانہ پکڑتے ہو۔

جب کوئی ناخدا ترس قوم یا فرد، اقتدار مطلق کے کسی مقام پر فائز ہوجاتی ہے، اور اس کے ہاتھ میں ایسی طاقت آجاتی ہے، جس سے وہ اپنے ہر منشا کو پورا کرسکتی ہے، تو پھر وہ اپنے زیر اثر افراد اور قوموں کے ساتھ، جو اس کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں، مٹی کی بے جان مورتوں اور کاغذ کے پرزوں کا سا سلوک کرنے لگتی ہے، وہ اس کو ان کے توڑنے رکھنے پھیلانے، کھولنے اور چٹکی سے مسلنے کا پورا اختیار سمجھتی ہے، وہ ان کی موت وحیات کے بارے میں اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے لگتی ہے، قرآن مجید فرعون کے متعلق جو اپنے کو ایسے ہی اقتدار مطلق کا مالک سمجھنے لگا تھا، کہتا ہے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ٥ (القصص ۳)	فرعون نے ملک میں سر اٹھا رکھا تھا اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا، ان میں سے ایک گروہ کو (یہاں تک) کمزور کردیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرڈالتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا، بیشک وہ مفسدوں میں سے تھا۔

ایک ایسے ہی خود پرست اور خود دست کی، جو ان اوصاف کے ساتھ چرب زبان اور سحر بیان بھی واقع ہوا ہے، قرآن مجید ان الفاظ میں تصویر کشی کرتا ہے، یہ درحقیقت ایک فرد واحد نہیں، بلکہ ایک خاص ذہنیت وکردار کی نمائندگی کرنے والی ایک مستقل نوع یا طبقہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ٥ وَإِذَا	اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ بناتا ہے

تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۚ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

(البقرہ ۲۰۴ - ۲۰۶)

حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے، اور جب اسکو کسی قسم کا اقتدار حاصل ہوتا ہے، تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے، اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے، اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا، اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے خوف کر تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے، سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے

انسانی تاریخ اس ذہنیت کے نمونوں اور نمائندوں کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے، رومی اور ایرانی اپنے اپنے وقت، اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس کا بہترین نمونہ تھے، اس نشۂ قوت، اور اس حد سے بڑھے ہوئے احساس برتری نے ان میں جو تخریبی صلاحیت، سفاکانہ ذہنیت اور مردم آزاری کی کیفیت پیدا کر دی تھی، وہ ان کی بے مقصد فتوحات، قوت پرستی اور انسان کشی کے واقعات سے عیاں ہے، ڈاکٹر ڈریپر (DRAPPER) اپنی کتاب معرکۂ مذہب وسائنس (CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE) میں لکھتا ہے :۔

"جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما، منتہائے ترقی پر فائز ہو گئی، تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجۂ اخیر کو پہنچ چکی تھی، اہل روما کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی، ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ زندگی کو ایک سلسلۂ تعیش بنا دے ......

"...... عالی شان حماموں، دلکشا تماشا گاہوں، اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے، اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے، جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سو نہ جائے، اہل روما کے سامان تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا، دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے، اس لئے کہ اس قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے، جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال و املاک کی ضبطی، صوبجات کے محاصل کی تشخیص، زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے، اور فرمانروائے دولت روما اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے۔"[1]

اس کے بعد ساتویں صدی ہجری کے نیم وحشی تاتاریوں کی اس یورش کی تفصیل جگر تھام کر تاریخ کی کتابوں[2] میں پڑھیئے، جن کو ایک دو تجربوں کے بعد اس کا احساس و علم ہو گیا تھا کہ اس وقت آس پاس کی دنیا میں ان کے سیل رواں کو روکنے والی کوئی طاقت موجود نہیں ہے، آج بھی اس کی تفصیل لرزتے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے بغیر پڑھنی مشکل ہے، یہ ایک فتنۂ جہاں سوز تھا، جس نے اس وقت کی متمدن دنیا کی چولیں ہلا کر رکھ دیں، اس وقت کے سارے انسانوں پر وحشت و دہشت، درماندگی اور مایوسی کی ایک کیفیت طاری تھی، جو اس وقت کی تاریخ ہی نہیں، ادب و

---

[1] "معرکۂ مذہب و سائنس" مترجمہ مولوی ظفر علی خاں ص ۴۹ ـ ۵۰

[2] مثلاً ابن کثیر کی "البدایہ والنہایہ"

شاعری اور اخلاق و تصوف کی کتابوں سے بھی عیاں ہے، مورد ملخ کے اس لشکر کی تاخت سے صرف آباد ملک، گلزار شہر، اور مردم خیز و پر رونق قصبوں ہی کی اینٹ سے اینٹ نہیں بج گئی، اور وہ خاک کے ایک تودہ میں تبدیل نہیں ہوئے، بلکہ پوری انسانی تہذیب اس کی لپیٹ میں آگئی، دنیا کی علمی و تمدنی ترقی صدیوں کے لئے بچھڑ گئی، عالم اسلام پر جو اس وقت مذہب و اخلاق اور علم و حکمت کا علمبردار تھا، علمی و فکری انحطاط کے سیاہ بادل چھاگئے، ذہانت کے سوتے عرصہ تک کے لئے خشک ہوگئے، عراق و ایران اور ترکستان سے جو علوم اسلامیہ کا ملجا و ماویٰ تھے ذہین و ذی علم خاندان اپنی جان و عزت بچانے کے لئے ہجرت کرکے ہندوستان میں پناہ لینے لگے، جو عالم اسلام کے بعید ترین سرے پر واقع تھا، جہاں ترکی النسل طاقت ور خاندان، جو ان وحشی تاتاریوں کو ترکی بہ ترکی جواب دے سکتے تھے، حکومت کر رہے تھے، عالم اسلام پر ایسا ذہنی اضمحلال، علمی انحطاط سایہ فگن ہوا کہ بعض علمی حلقوں نے اجتہاد کے دروازہ کو بند کر دینے اور تقلید پر انحصار کر لینے میں عافیت اور سلامتی سمجھی۔[2]

سیزر، سکندر اعظم، چنگیز و ہلاکو اور تیمور لنگ و نادر شاہ افشار، سب اسی نشۂ قوت کے بیمار اور اپنے اپنے وقت میں نوع انسانی کے بے درد شکاری اور اپنے زور شمشیر اور قوت تسخیر کا دنیا کو تماشا دکھانے والے خطرناک بازیگر تھے، ان کے ان

---

[1] اس کی قدرے تفصیل ہماری کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کے حصہ اول کے باب "فتنۂ تاتار اسلام کی ایک نئی آزمائش" میں آگئی ہے، ص ۳۹۳ - ۴۰۴

[2] علامہ اقبال کے یہاں آٹھویں صدی ہجری کے بعد سے علمائے اسلام کے اجتہاد سے کام نہ لینے اور تقلید کو ضروری سمجھنے کی یہی علمی و تاریخی توجیہ ہے۔

رزمیہ کارناموں، اور ان کی اس صید افگنی اور زور آزمائی کی خونی داستان پڑھنے کے بعد اقبال کے حسب ذیل شعر پڑھئے، اور داد دیجئے کہ انہوں نے کس طرح تاریخ کے ہزاروں صفحات کا عطر اپنے ان تین شعروں میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں | سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے | صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے | عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

مشرق میں بہت سے دانشوروں کا احساس ہے کہ اس بیسویں صدی عیسوی میں یورپ (اپنے دونوں مشرقی و مغربی کیمپوں کے ساتھ) اور امریکہ قوموں اور تہذیبوں کے اسی قدیم مرض نشۂ قوت اور حد سے بڑھے ہوئے "احساس برتری" کے بیمار ہیں انہوں نے اپنے کو قوموں اور ملکوں اتالیق و سرپرست اور ان کی قسمت کا مالک سمجھ لیا ہے، وہ بھی ہر مسئلہ کو قوت کے ترازو پر تولتے اور سود و زیاں کے معیار سے جانچتے ہیں، وہ بھی دنیا کے کسی گوشہ میں کسی صالح قیادت کو ابھرنے اور اگر ابھر آئے تو پنپنے نہیں دیتے، بلکہ اب تو مشرق کے بہت سے مبصروں کا خیال یہ ہے کہ اکثر مشرقی اور ایشیائی اور بالخصوص اسلامی ملکوں کی صورت حال کے بگڑنے اور وہاں کے ذہنی و اخلاقی انتشار کی ذمہ دار مغرب کی یہی لیڈر شپ ہے۔

حق و انصاف سے بے نیاز، سود و زیاں کی منطق مغربی قیادت کو مشرق کے کسی مسئلہ پر حقیقت پسندانہ غور کرنے اور اس کا منصفانہ حل تلاش کرنے کی اجازت نہیں دیتی، وہ وہ کمزور لیکن برسر حق مظلوم کا ساتھ دینے کے بجائے، طاقتور ظالم کا ساتھ دیتی ہے، اسی کی وجہ سے اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کے جیسے مفید ادارے بھی، اپنا مقصد پورا

کرنے، کسی آنے والی مصیبت کو روکنے اور انسانیت کی بے لوث خدمت کرنے سے قاصر ہے، خلوص اور غیر جانبداری کے اس اہم عنصر کے فقدان نے مغرب کی ان عظیم فیاضانہ مالی، غذائی اور ترقیاتی امدادوں کو بھی، تقریباً بے اثر بنا دیا ہے، جن کے دہانے اس نے کھول رکھے ہیں، اور مشرق پر ان کا وہ اخلاقی اثر نہیں ہے، جو ہونا چاہیئے۔

لیکن یہی طاقت جب ایک صالح مقصد اور ایک مصلح رہنما کے ماتحت اور زیر اثر ہوتی ہے، اور وہ پیل بے زنجیر نہیں بلکہ ایک راہ داں اور راہ بیں اور رہنما شہسوار کی راکب نہیں بلکہ مرکب، متبوع نہیں بلکہ تابع، مقصد نہیں بلکہ وسیلہ ہوتی ہے، تو وہ قہر و عذاب کے بجائے، نعمت و رحمت، ہلاکت کے بجائے حیات، تخریب کے بجائے تعمیر کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس سے مظلوموں کی دادرسی، صدیوں کے غلاموں کی، بند غلامی سے آزادی، حقوق کی بلکہ انسان کی حیثیت عرفی کی بحالی کا کام لیا جاتا ہے، اس سے دنیا میں پھر ایک نئے دور کا آغاز اور جہانِ نو کی تعمیر ہوتی ہے، اس لئے وہ کہتے ہیں ؎

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق[1]

اقبالؔ کے نزدیک اس کی بہترین مثال اسلام کے حلقہ بگوش اور داعی عربوں کی وہ مبارک فتوحات اور خدا کی دی ہوئی طاقت کا وہ صحیح استعمال ہے، جو انہوں نے انہیں کے ایک سفیر کے الفاظ میں انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر، خدائے واحد کی بندگی میں داخل کرنے، دنیا کے تنگ قفس سے رہائی دے کر دنیا اور آخرت کی بیکراں وسعتوں سے آشنا بنانے، مذاہب کی ناانصافیوں اور کوتاہ اندیشیوں سے خلاصی دے کر

---

[1] ضرب کلیم بہ عنوان "قوت و دین"۔

اسلام کے عدل و انصاف سے متمتع ہونے کے لئے کیا تھا، انہوں نے اپنے ان اشعار میں جن میں انہوں نے خود امت عربیہ کو مخاطب کیا ہے، بڑے دلآویز طریقہ پر عربوں کے اس تعمیری اور انقلابی کارنامہ کو بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ یہ کس ایمان وعقیدہ اور کس کی دعوت وپیغام کا فیض تھا، یہ انکے فارسی کلام کے حسین ترین حصوں میں ہے ؎

از دم سیراب آں امی لقب — لالہ رست از ریگ صحرائے عرب
حریت پروردۂ آغوش اوست — یعنی امروز امم از دوش اوست
او دلے در پیکر آدم نہاد — او نقاب از طلعت آدم کشاد
ہر خداوند کہن را او شکست — ہر کہن شاخ از نم او غنچہ بست
گرمی ہنگامۂ بدر وحنین — حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ
سطوت بانگ صلاۃ اندر نبرد — قرأت الصافات اندر نبرد
تیغ ایوبی نگاہ بایزید! — گنجہائے ہر دو عالم را کلید
عقل و دل را مستی از یک جام مے — اختلاط ذکر و فکر رومؔ و رےؔ
علم و حکمت شرع و دیں نظم امور — اندرون سینہ دلہا ناصبور
حسن عالم سوز الحمرا و تاج — آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج
ایں ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست — یک تجلی از تجلیات اوست
ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز — باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

حمد بے حد مر رسول پاک را
آں کہ ایماں داد مشت خاک را[1]

---

[1] پس چہ باید کرد ص ۵۲

ترجمہ :۔

۱۔ اس امی لقب نبیؐ کی خوش انفاسی کے فیض سے صحرائے عرب کے ریگزاروں میں گل و لالہ کی بہار آگئی۔

۲۔ آزادی کا جذبہ آپ ہی کی آغوش مبارک کا پروردہ ہے، اور اس طرح گویا اقوام عالم کی حالیہ ترقیاں آپ کے عظیم ماضی کا نتیجہ ہیں۔

۳۔ انسان کے پیکر خاکی میں آپ نے دھڑکتا ہوا دل رکھ دیا اور صحیح معنوں میں انسان کی صلاحیتوں سے پردہ اٹھایا اور اس کے جوہر ذاتی کی چہرہ کشائی کی۔

۴۔ آپ نے تمام ہی خدایان کہن کو شکست فاش دی اور آپ کے فیض سے مرجھائی ہوئی شاخوں پر برگ و بار آنے لگے۔

۵۔ بدر و حنین کی گرمیٔ ہنگامہ آپ ہی کے جوش و خروش کے دم سے تھی، اور حضرت صدیقؓ و فاروقؓ، حیدرؓ کرار اور شہید عالی مقام حضرت حسینؓ کی انقلابی شخصیتیں آپ ہی کی ہمہ صفت ذات کی تجلیاں تھیں۔

۶۔ حالت جنگ میں بلند ہونے والی اذان کی سطوت و ہیبت اور تلاوت الصافات کی لذت و حلاوت آپ ہی کی دی ہوئی ہے۔

۷۔ صلاح الدین ایوبی کی شمشیر آبدار، اور بایزید بسطامی کی حقیقت بین نگاہ دو عالم کے خزانوں کی کلید ثابت ہوئیں۔

۸۔ ساقیٔ مدینہ کے ایک جام سے عقل و دل دونوں ہی مست و سرشار ہوگئے، اور آپ کی تربیت گاہ میں رومی کا ذکر اور رازی کی فکر فلک پیما ہم آہنگ ہوئی۔

۹۔ علم و حکمت، دین و شریعت اور انتظام سلطنت اور دنیا کے اندر پھیلی ہوئی

روحانی طلب وتلاش اور سینوں میں دلوں کی بے قراری۔

۱۰۔ الحمرا، اور تاج محل کا وہ حسن عالم سوز و دل افروز جو فرشتوں سے بھی خراج عقیدت لے لیتا ہے۔

۱۱۔ یہ سب کارنامے آپ کے اوقات عزیز و گرانمایہ کے ایک مختصر لمحہ اور آپ کی تجلیات باطنی کی طرف ایک تجلی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۲۔ آپ کے فیض ظاہری کے اثرات ان جلوہ ہائے دلفروز کی شکل میں تو ظاہر ہو گئے، لیکن آپ کے وجود مبارک کا باطنی پہلو عارف کامل کی نگاہ سے بھی پوشیدہ ہے۔

۱۳۔ رسول پاکؐ کی عظیم ہستی بے حد تعریفوں کی مستحق ہے، جس نے مشت خاک کو ایمان دے کر جوہر قابل بنا دیا۔

دنیا کے عجائبات میں سے تاریخ کا یہ کلیہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے عظیم سلطنتوں کی بنیاد رکھی، اور جن کی بدولت خستہ حال اور پامال قوموں کو عروج و ترقی، عظمت و شوکت اور اقبال و کامرانی کے دن دیکھنے نصیب ہوئے، وہ ہمیشہ جفاکش، سخت کوش، سخت جان، ہر قسم کی راحت و تنعم سے بے نیاز اور نہایت سادہ پرمشقت اور خشک زندگی گزارنے کے عادی تھے، اور اسی مہم جوئی، بلند حوصلگی، اور سخت کوشی کی وجہ سے وہ سخت نامساعد حالات میں ان سلطنتوں کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے، جو صدیوں تک ہلائے نہ ہل سکی، لیکن دولت و وسائل کی فراوانی، فاسد ماحول، خود غرض مصاحبین اور خوشامدی درباریوں نے ان کے اخلاف و جانشینوں پر رفتہ رفتہ اثر ڈالا، ان کے قوائے عمل مضمحل ہونے لگے، وہ عیش و عشرت کے خوگر، تن آسانی، راحت طلبی اور تنعم

کے اس طرح شکار ہوئے کہ ان کو ہل کر پانی پینا دشوار ہو گیا، وہ رزم کے بجائے بزم کے مردمیدان بن گئے، شراب وشاہد، چنگ ورباب، اور مطرب ومغنی ان کے دمساز وہمراز تھے، جن کے بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا، سلطنت کی حفاظت وتوسیع اور نئی نئی فتوحات کے بجائے ان کی ساری ذہانت لباسوں کی تراش خراش، کھانوں کی نئی نئی قسمیں ایجاد کرنے، اور عیش وعشرت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں صرف ہونے لگی، اور اس میں وہ ان حدود اور اس انتہا تک پہنچ گئے جہاں آسانی کے ساتھ ایک متوسط آدمی کے تخیل اور قیاس کا پہنچنا بھی مشکل ہے، یہ تاریخ عالم کا ایک ایسا کلیہ ہے، جس میں مشکل سے استثنا ملے گا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قانون قدرت ہے، اور مال و دولت، سلطنت وحکومت اور ہر طرح کے وسائل کی فراہمی وفراوانی کا ایک منطقی نتیجہ ہے، قرآن مجید نے اپنے مسلّم ایجاز واعجاز کے ساتھ اس حقیقت کو ان بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ (سورۃ العلق)

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جب کہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔

ایک ایک قوم اور ایک ایک سلطنت کی تاریخ پڑھیے آپ کو آغاز وانجام میں یہی تفاوت اور بانیان سلطنت کے اخلاق، طرز زندگی، معیار واقدار اور ان کے نااہل وارثوں کے اخلاق واطوار اور اقدار ومعیار میں یہی تضاد نظر آئے گا۔

ہم یہاں پر صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے، جن کا تعلق اس ملت سے ہے، جو دنیا میں اخلاقی تعلیمات کی سب سے بڑی علمبردار اور اس پیغمبر کی نام لیوا ہے، جس نے پیٹ پر پتھر باندھے، جس نے فقر کو اپنا فخر قرار دیا اور جس ملت کی بنیاد زہد وقناعت،

احتساب نفس، اور خدمت خلق پر پڑی، ایران و روما، مصر و یونان اور دنیا کے دوسرے ممالک کی سلطنتوں اور تہذیبوں کی تاریخ میں اس کی صدہا مثالیں ملیں گی۔

سب جانتے ہیں کہ عرب اسلام کا پیغام پہنچانے اور دنیا کو "خدا کی حکومت" میں شامل کرنے کے لئے جب جزیرۃ العرب سے نکلے تھے تو ان کا کیا حال تھا، وہ کس قدر جفاکش، سخت کوش، تمدن کے لوازمات اور تکلفات سے کس قدر ناآشنا اور بیگانہ تھے، ان کی زندگی کس قدر فقیرانہ اور زاہدانہ بلکہ سپاہیانہ تھی[1]، انہوں نے اسلام کے پیغام کی قوت تسخیر اور اپنی اس زندگی کی خصوصیات کے زور سے جس سے اس وقت کی دنیا کی قومیں یکسر محروم ہوگئی تھیں، عظیم سلطنتیں قائم کیں، ان میں سے ایک سلطنت عباسیہ تھی، جس کا پایۂ تخت بغداد تھا، اور جس نے خلافت کے نام سے تقریباً پانچ سو برس بڑے کروفر سے حکومت کی اور تقریباً اس وقت کی متمدن دنیا کے آدھے حصہ کو زیر نگیں کرلیا، اس کے بانی اور ابتدائی حکمران ہارون و مامون تک (ان شاہانہ اولوالعزمیوں اور خوش باشیوں کے ساتھ جو مشہور خاص و عام ہیں) جفاکش، سخت کوش، سپاہیانہ زندگی کے عادی اور میدان جنگ کے شہسوار بھی تھے، لیکن رفتہ رفتہ اس سلطنت کو بھی عیش و عشرت کا گھن لگ گیا، اس کے تخت نشین جو خلافت اسلامی کی نسبت گرامی کے بھی حامل تھے، عیش و عشرت کے دلدادہ اور دولت و وسائل کی بہتات کی پیدا کی ہوئی بیماریوں کے بری طرح شکار ہوگئے، دارالخلافہ بغداد میں عیش و عشرت اور خود فراموشی و غفلت کا ایک سیلاب آیا، جس سے بڑے بڑے عقلاء و فضلاء سنجیدہ و باوقار لوگوں کے دامن بھی آلودہ اور تر ہوگئے، سارے بغداد میں اور

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا رسالہ "المد والجزر فی تاریخ الاسلام"

اس کے اثر سے قرب وجوار میں زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی کی فضا چھا گئی، اور عیش ونشاط کا دور دورہ ہوا، اس غفلت وسرمستی کا نتیجہ آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کی خلافت میں تاتاریوں کے اس وحشیانہ حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا، جس سے علم و تہذیب کا یہ گہوارہ ایک وحشتناک مقتل میں تبدیل ہو گیا، جس کی تفصیل لکھنے سے مسلمان مورخین کا قلم بھی بار بار رکتا ہے[1]۔

ایک مورخ نے بغداد کے اس عہد کی تصویر بڑی خوبی سے کھینچی ہے، دسویں صدی کے ایک مشہور عالم و مورخ مفتی قطب الدین نہروالی مکی مستعصم کے عہد میں اہل بغداد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"نرم وگرم بستروں میں آسودہ بغداد کے کنارے، چین کی بانسری بجانے والے، آبِ رواں اور صحن گلشن کے عادی، دوست احباب کی محفلیں گرم، اور دسترخوان میووں اور مشروبات سے پُر، انہوں نے نہ کبھی حرب و ضرب سے واسطہ رکھا، نہ جنگ کی تلخی سے ان کے کام و دہن آشنا ہوئے[2]"

دوسری مثال ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی ہے، جس کا بانی ظہیر الدین بابر تیموری (۱۴۸۲ء ـ ۱۵۳۰ء) تھا اس سلطنت کی حقیقی بنیاد، توبہ وانابت کی کیفیت زندگی کی تبدیلی کے عزم، سخت کوشی اور جانبازی اور عزم صادق سے پڑی، بابر نے جب یہ دیکھا کہ رانا سانگا کے ایک لاکھ سپاہیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت اول" باب "فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" ص ۳۲۸ ـ ۴۰۴ ـ

[2] الاعلام بأعلام بیت اللہ الحرام ص ۱۸۰ ـ

پاس صرف بیس ہزار سپاہی ہیں، جو بیگانہ ملک میں ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی کمک اور رسد سے محروم ہیں، تو اس نے فتح کا ایک دوسرا راستہ اختیار کیا، مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

"فردوس مکانی نے تھوڑے غور و تامل کے بعد کہا کہ میری اس بزدلی پر دنیا کے اسلامی فرمانروا مجھے کیا کہیں گے، ظاہر ہے کہ سبھوں کا یہ خیال ہوگا کہ محض اپنی جان کی خیر مانگ کر اتنے بڑے وسیع ملک کو اس طرح ہاتھ سے کھو بیٹھا میرے نزدیک یہی بہتر ہے کہ شہادت کی سعادت کو مدنظر رکھوں اور مردانگی کے ساتھ معرکہ کارزار میں دل و جان سے کوشش کروں۔

اہل مجلس نے بادشاہ کی یہ تقریر سنی اور ہر گوشہ سے بالاتفاق جہاد کا نعرہ بلند ہوا، بادشاہ کی تقریر کا دل پر ایسا اثر ہوا کہ ہر شخص نے سر تسلیم خم کر کے بالاتفاق یہی کہا کہ شہادت سے زیادہ اور کون سی سعادت محبوب ہو سکتی ہے، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا قول ہے کہ مارا تو "غازی" اور مرے تو "شہید" ہم سب شرعی قسم کھاتے ہیں کہ معرکہ کارزار سے منہ موڑنے کا خیال تک دل میں نہ لائیں گے امیروں نے مزید اطمینان کے لئے اپنے عہد و پیمان کو حلف سے اور زیادہ مضبوط کیا، بادشاہ نے جس کا یہ حال تھا کہ کسی وقت بھی اسے بلا ساقی و شراب چین نہ تھا، مصلحت وقت کے لحاظ سے بادہ نوشی بالکل ترک کر دی بلکہ تمام مکروہات یہاں تک کہ ریش تراشی سے بھی توبہ کر لی[1]۔"

---

[1] تاریخ فرشتہ ۲/۲۱۹ ترجمہ اردو حیدر آباد ۱۹۲۶ء

جس سلطنت کی بنیاد اس عزم وحزم، اس جانبازی وجاں سپاری اور خدا سے عہد و معاہدہ پر ہوئی تھی، اور جس کے اولوالعزم بانی کے جانشینوں میں ہمایوں جیسا عالی ہمت، اکبر جیسا اولوالعزم، اورنگ زیب جیسا مرد آہن پیدا ہوا، رفتہ رفتہ وہ کس طرح سلطنتوں کے زوال اور شاہان قدیم کی عیش کوشی اور خود فراموشی کے راستہ پر پڑ گئی اس کا ایک نمونہ محمد شاہ (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) کی زندگی اور اس کے محل و دربار کا نقشہ ہے، جو عوام کی زبان میں "رنگیلے" کے نام سے مشہور ہے، اس کا تذکرہ ایک مورخ نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے، جو تاریخ کی شہادتوں پر مبنی ہے :-

"(نادر شاہی حملہ کے وقت) عیش و عشرت کا زور و شور تھا، محمد شاہ صاحب سر بسر تھا تن آسانی کے سوا کسی کام سے کام نہ تھا، ہر وقت ہاتھ میں جام اور بغل میں دلآرام تھا، کس کو دماغ تھا کہ نادر شاہ کے نامہ کا جواب لکھتا، مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ ہندوستان کی سپاہ میں سکت کہاں تھی کہ وہ افغانوں کو نکالتی اور روکتی"[1]

"(محمد شاہ نے) تیس سال سلطنت کر کے خاندان تیموریہ کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا، اور عیش و عشرت کے وہ سامان جدید ایجاد کئے کہ جن کی پیروی سے آج تک امیروں کا ستیاناس ہوتا ہے"[2]

سلطنتوں کے اس آغاز و انجام، قوموں کے ماضی و حال کے اس عظیم تفاوت کو ان قوموں کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھ کر جس کی یہاں صرف دو مثالیں پیش کی گئی ہیں، آپ اقبال کے اس شعر کی صداقت کا اندازہ لگایئے، جس میں انہوں نے

---

[1] تاریخ ہندوستان : ذکاء اللہ ۹/۲۵۲ [2] ایضاً ۹/۲۸۴

دنیا کے ہزاروں سال کی تاریخ اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

لیکن یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا، اگر اس میں اتنا اضافہ نہ کیا جائے کہ جب طاؤس و رباب کا یہ دور آتا ہے، اور قوموں اور سلطنتوں پر زندگی سے تمتع، تفریح و تعیش کا ہسٹریائی دورہ پڑتا ہے، اور اس سلسلہ میں وہ ہر اخلاقی حد کو پھلانگ جاتی اور ہر حقیقت کو نظر انداز کر دیتی ہیں، تو خدا کی حکمتِ بالغہ اس موقع پر عمل جراحی کو ضروری سمجھتی ہے، اور اس عمل جراحی کے لئے کسی چنگیز، کسی تیمور، اور کسی نادر شاہ افشار کا انتخاب کر لیتی ہے، جو اس فاسد پھوڑے پر نشتر کا کام کرتا ہے، اقبال ہی کا شعر ہے ؎

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

قدیم ملوکیت اور مطلق العنان سلطنتوں کا دور تقریباً ختم ہو چکا ہے، اب سلطانیٔ جمہور کا دور آیا ہے، اور دنیا کی ساری طاقت، دولت اور قیادت مغرب میں (جس میں یورپ اور امریکہ دونوں شامل ہیں) مرکوز ہو گئی ہے، دنیا کی یہ قیادت اپنے آخری نقطۂ عروج پر پہنچنے اور مغربی تہذیب اپنی آخری صلاحیتوں کا اظہار کر دینے کے بعد اب جنون کے اس مرحلہ سے گزر رہی ہے، جس سے دنیا کی قدیم ملوکیتیں اور گزشتہ تہذیبیں گزریں، حقائق سے چشم پوشی، کمزور اور بے مزر قوموں کے حقوق کی پامالی، تفریح و تعیش اور نفس پرستی کی بحرانی (ہسٹریائی) کیفیت زندگی سے بیزاری اور

اکتاہٹ، اخلاقی اور جنسی انحراف، عجلت اور جدت کا عشق، اجتماعیت کے خلاف شدید ردعمل اور انفرادیت کا غلبہ، نتائج وعواقب سے مکمل چشم پوشی اور لذت ومنفعت کے سوا ہر محرک کا مفقود ہو جانا بتاتا ہے کہ یہ قیادت اپنی صلاحیت اور افادیت کھو چکی ہے، اور یہ تہذیب عالم نزع میں گرفتار ہے۔

ایسے ہی موقع پر دنیا میں کوئی تازہ قیادت ابھرتی تھی اور کوئی نئی طاقت اس فاسد پھوڑے پر نشتر کا کام کرکے، انسانیت کے جسم کو ہلاکت سے بچالیتی، اور اس کے عروق میں زندگی کا تازہ خون دوڑا دیتی تھی، لیکن مغربی تہذیب نے دنیا میں کوئی دوسری قیادت وطاقت باقی نہیں رکھی، اور اس وقت عالم کے کسی گوشہ سے کسی نئی قیادت کے ابھرنے اور کسی تازہ دم تہذیب کے میدان میں آنے کی کوئی امید نہیں ہے، اس لئے کہ دنیا کی ساری قیادتیں مغرب کی قیادت کی حاشیہ بردار (CAMP FOLLOWER) اور دوسری تہذیبیں مغربی تہذیب کی حلقہ بگوش یا اس کے سامنے سپرانداز ہو چکی ہیں، اس لئے اب ایسا نظر آتا ہے کہ اب اس عمل جراحی کے لئے باہر سے کوئی نشتر نہیں آئے گا، اور نہ اس کی ضرورت ہے، اس لئے کہ بقول اقبالؔ وہ اپنی خود لگائی ہوئی جراحتوں سے نیم جاں ہو رہی ہے، ؎

کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتادست

وہ عرصہ سے جس خطرناک راستہ پر پڑ گئی ہے، اور اس نے ناخدا ترس اور بے ضمیر انسانوں کو ہلاکت وتخریب کی جو غیر محدود طاقت وصلاحیت مہیا کر دی ہے،

وہ قریب ہے کہ خود اس کا کام تمام کر دے ؎

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

